

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۴۴، شمارہ ۳ ؛ سن اجرا ۱۹۳۸ء

مارچ ۱۹۸۴ء

فون : ۳۸۴۶۹



قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرسالانہ : ۲۰ روپے، کتب خانوں سے ۲۵ روپے
ـــــ بذریعہ رجسٹری ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے،

ہوائی ڈاک سے		بحری ڈاک سے
مشرق وسطی	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، بنگلہ دیش	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر حیدرآباد ۔ ۴ (اے۔پی) سے شائع کیا۔

کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۴

فہرست

اپنی بات

یہ تو ہم سب سنتے آئے ہیں کہ شکوہ یا شکایت کے معنی شکست کے ہیں یعنی ہم حالات یا زمانہ کا شکوہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم [illegible] اور ہم نے اپنی شکست یا پست ہمتی کا اعتراف کیا گیا کہ [illegible] ہمت، جوان، مصمم ارادہ اور حسن تدبیر کے ساتھ تقدیر بدل سکتی ہے نیک مقاصد افراد اور اقوام کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرنا جانتی ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والے صرف [illegible] قوم کی کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

زمانہ کا اشارہ اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اردو سمجھنے بولنے اور لکھنے پڑھنے والے [illegible] میدان عمل میں قدم [illegible] اپنے ملک اور [illegible] کی خدمت کے جذبے کے ساتھ [illegible] آگے بڑھیں۔ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی امید کی کرن نظر آتی ہے یہ قدرت کا نظام ہے۔ [illegible] اور [illegible] زندگی کا قافلہ [illegible] امید افزا [illegible] تہذیب و تمدن کے سرمایہ [illegible] گراں قدر اضافہ ہوتا [illegible] کامیابی کا [illegible] کام کرنا ہی کامیابی ہے [illegible] دوہرانا [illegible] اگر ہم واقعی خلوص دل کے ساتھ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کے حلقہ کو وسیع کرنے [illegible] اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں اردو کی ابتدائی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے پروگرام کو آگے بڑھائیں تو ہمارے ملک میں اردو کا مستقبل یقیناً روشن و تابناک ہوگا۔ آپ "آج" کی فکر کیجئے "مستقبل" خود بخود تابناک ہوگا۔ جو آج کی فکر [illegible] وہ [illegible] ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ بقول اقبال
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں [illegible] نہیں ہے۔

محمد منظور احمد

محمد منظور احمد

جناب محمد اکبرالدین صدیقی سے انٹرویو

میں نے جناب محمد اکبرالدین صدیقی سابق ہیڈ شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ سے حال ہی میں ایک انٹرویو لیا تھا۔ میں شکرگزار ہوں کہ جناب صدیقی نے میرے ہر سوال کا جواب نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ دیا اور اس طرح ۲½ گھنٹوں پر مشتمل اس انٹرویو سے جناب صدیقی کی زندگی، شخصیت اور ادبی خدمات کے بارے میں مجھے اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ انٹرویو کا وقت بھی صدیقی صاحب کی عمر اور عام صحت کا لحاظ کرتے تکلیف دہ تھا۔ یعنی موسم گرما میں ۱۱ بجے صبح۔ انٹرویو ختم ہوتے ہوتے ۲ بج چکا تھا میں اس سلسلے میں صدیقی صاحب کے ضبط و برداشت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) کی آٹھویں جماعت میں میری طالب علمی کے دوران، صدیقی صاحب میرے استاد بھی رہ چکے ہیں۔ انٹرویو کے آغاز میں انہوں نے کہا کہ وہ ۵ نومبر ۱۹۱۲ء کو بھینسہ ضلع عادل آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کے وقت بھینسہ ضلع ناندیڑ میں شامل تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء سے ضلع عادل آباد کا ایک تعلقہ ہے۔ ضلع عادل آباد آندھرا پردیش میں ہے اور اُس وقت نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی مملکت حیدرآباد میں شامل تھا۔

آپ کے والد جناب محمد اکرام الدین صاحب بھینسہ میں ناظر عدالت تھے۔ ان کا تبادلہ ناندیڑ پر عمل میں آیا اس کے بعد قندھار میں سررشتہ دار عدالت ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد آپ کی تعیناتی پھر ایک بار بھینسہ پر عمل میں آئی۔

میرے ایک سوال کے جواب میں آپ نے کہا کہ آپ کے والد اردو اور فارسی میں نعت اور نظموں کے علاوہ کبھی کبھی عربی میں بھی نعت لکھا کرتے تھے۔ اپنی ہائی اسکول کی تعلیم پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب صدیقی نے کہا کہ ان کی تعلیم کی ابتدا ناندیڑ سے ہوئی۔ ناندیڑ سے آپ کے والد صاحب کے قندھار

تبادلہ کے بعد آپ قندھار کے اسکول کی جماعت سوم میں شریک ہوئے۔ آپ نے بتایا کہ ۱۹۱۷ء میں مڈل کا سالانہ امتحان' بورڈ کا سرکاری امتحان ہوا کرتا تھا۔ کامیابی پر سند بھی دی جاتی تھی۔ بورڈ کی طرف سے مڈل کے امتحان میں کامیابی پر دی ہوئی یہ سند میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ مڈل کا یہ امتحان جس میں' میں نے شرکت کی تھی' بورڈ کی طرف سے لیا جانے والا آخری سرکاری امتحان تھا۔ اس کے بعد مڈل کے سرکاری امتحان کا یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ آپ نے کہا کہ انگریزی کی خاطر میں حیدرآباد میں مدرسہ وسطانیہ' شاہ گنج میں شریک ہوا۔ حیدرآباد میں اس وقت میرا قیام ڈاکٹر زورؔ کے دولت کدہ پر رہا۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر زورؔ ایم اے کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ لیکن اُن کی مشہور کتاب "روحِ تنقید" شائع ہو چکی تھی۔ چنانچہ "روحِ تنقید" کا ایک نسخہ ڈاکٹر زورؔ نے میرے والد صاحب کو تحفتہً دیا تھا۔

مدرسہ وسطانیہ شاہ گنج میں شرکت کے بعد میں ملیریا کے مرض میں مبتلا ہوا۔ علالت کا یہ سلسلہ چلا تو چار مہینے بعد ضلع بیڑ چلا گیا اور میں نے اس ضلع کے ہائی اسکول میں پری میٹرک میں داخلہ لیا۔ یہاں میرے تایا زاد بھائی محمد افضل الدین فاروقی [illegible] تھے جو نواب علی یاور جنگ کے کلاس میٹ اور ہاسٹل میں ان کے روم میٹ بھی تھے۔ وہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے گریجویٹ تھے اور سیشن جج کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ تایا زاد بھائی جناب محمد افضل الدین فاروقی کی دلچسپی اور ہمدردی کی بدولت میں اپنی تعلیم کے سلسلہ کو جاری رکھ سکا۔ ۱۹۲۰ء میں میرے والد جناب محمد اکرام الدین کا بیڑ میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بھی بیڑ ہی میں عمل میں آئی۔ انتقال کے وقت میرے والد صاحب سررشتہ دار عدالت اور برسرِ خدمت تھے۔ (۵۲) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ نے کہا کہ والد صاحب کے انتقال کے بعد میں حیدرآباد آیا اور گورنمنٹ سٹی کالج کی جماعت پری میٹرک یعنی' نویں جماعت میں ۱۹۲۱ء میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ سٹی کالج ہی سے میں نے عثمانیہ میٹریکولیشن کا امتحان بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ گورنمنٹ سٹی کالج سے ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ اور عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۲۶ء میں بی اے بدرجہ سوم کامیاب کیا اور سٹی کالج میں ٹیچر کی حیثیت سے میرا تقرر عمل میں آیا۔ صغیر سے چھٹی جماعت تک مختلف کلاسوں میں اردو اور فارسی پڑھانے کا کام میرے تفویض کیا گیا۔ ایم اے (اردو سے) خانگی امیدوار کی حیثیت سے میں نے ۱۹۴۲ء میں کامیاب کیا۔ ٹیچر کی حیثیت سے (۱۶) سال کی ملازمت کے بعد' میں نے ایم اے کا یہ امتحان دیا تھا۔ ٹیچر ہونے سے پہلے سررشتہ کروڑگیری میں

صرف ایک پینہ ابلکار (کلرک) کی حیثیت سے کارگذار رہا۔

میٹرک، انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں اپنے مضامین کے بارے میں آپ نے کہا کہ میٹرک میں آپ کا اختیاری مضمون فارسی تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں اردو، فارسی اور معاشیات اور بی اے میں انگریزی اور دینیات لازمی مضامین اور اردو فارسی اختیاری مضامین تھے۔

میٹرک، انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے اساتذہ کے بارے میں استفسار پر آپ نے کہا کہ عثمانیہ میٹرک کے اساتذہ میں فارسی کے لئے جناب عمر فاروق، اردو کے لئے جناب سید محمد، انگریزی کے لئے محمد علی صاحب اور یوسف علی صاحب تھے۔

مولوی غلام محی الدین عرف چھوٹے مولوی صاحب ہم طالب علموں کو دینیات پڑھایا کرتے تھے۔ تاریخ و جغرافیہ کے لئے سید حسین زیدی صاحب، ریاضی کے لئے رتن لال صاحب، طبیعات کے لئے سدرشن راج صاحب اور کیمسٹری کے لئے خلیل الرحمٰن صاحب مامور تھے۔

انٹرمیڈیٹ کے میرے اساتذہ میں، اردو کے لئے جناب سید محمد صاحب اور جناب ابوظفر عبدالواحد، فارسی کے لئے، جناب علی رضا شیرازی، انگریزی کے لئے جناب عطاء الرحمٰن، اور مسٹر دراسوامی تھے جو آگے چل کر عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔ میں نے انٹر میں معاشیات خواجہ منیر الدین اور جناب میر محمود علی سے پڑھی تھی۔ میر محمود علی صاحب، صنعتی نمائش کیٹی (نمائش مصنوعات ملکی) کے پہلے صدر تھے۔ یہ صنعتی نمائش، سب سے پہلی بار باغ عام (پبلک گارڈن) میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کے انعقاد اور انتظام کے سلسلے میں، میں نے بھی ایک والنٹیر کارکن کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اُس وقت میں، سٹی ہائی اسکول میں ٹیچر تھا۔ انٹرمیڈیٹ میں ہمیں دینیات جناب سید نبی صاحب نے پڑھائی تھی۔ نواب لطیف یار جنگ سابق ناظم آبکاری کے صاحبزادے جناب عبدالقیوم بھی دینیات پڑھاتے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں بی اے کے اساتذہ میں انگریزی کے لئے جناب پروفیسر حسین علی خاں اور دراسوامی، ڈاکٹر سید عبداللطیف، پروفیسر ویرا بھدر راؤ، پروفیسر اسپیٹ اور پروفیسر ہاڈنگ تھے۔

اردو کے اساتذہ میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر شعبہ اردو تھے اور تنقید پڑھاتے تھے۔ اردو کے دیگر اساتذہ میں ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری اور ڈاکٹر سید سجاد تھے۔ پروفیسر سید سجاد موٹر کے ایک حادثہ کے بعد رخصت بیماری پر تشریف لے گئے تو جناب شیخ چاند کا تقرر منصرم کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ شیخ چاند صاحب نثر پڑھاتے تھے۔ وہ یہاں سات مہینے رہے

اور پھر اورنگ آباد چلے گئے۔ بی اے میں شیخ عبدالحمید خاں شروانی نے فارسی پڑھائی تھی،
اس زمانے میں ڈاکٹر نظام الدین صاحب صدر شعبہ فارسی تھے۔ ڈاکٹر قاری سید کلیم اللہ حسینی صاحب
اور لطیف احمد فاروقی صاحب بھی اساتذہ شعبہ فارسی میں شامل تھے۔

شعبہ عربی میں مولوی سید ابراہیم، جامعہ نظامیہ کے فارغ التحصیل تھے اور علامۃ الدہر تھے
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کے افسانوی طرز کے ہنگامہ پرور اور سنسنی خیز یادگار
مضمون " آسمانِ شہرت پر پرواز " میں مولوی سید ابراہیم ان اساتذہ جامعہ میں شامل تھے
جنھیں اُٹھا کر آسمانِ شہرت پر لے جایا گیا تھا۔

آپ نے بتایا کہ شعبہ ہندی میں پنڈت ونشی دھر ودیالنکار لکچرار کی حیثیت سے کام
کر رہے تھے۔

اُردو میں مضامین نظم و نثر لکھنے کے مشغلہ کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں
جناب محمد اکبرالدین صدیقی نے کہا کہ میٹرک میں زیر تعلیم تھا کہ افسانے پڑھنے اور لکھنے کا شوق
پیدا ہوا۔ میرے لکھے ہوئے افسانے بمبئی کے ہفتہ وار اخباروں " مصور " (ہفتہ وار) " الاعظم " (ہفتہ وار)
کے علاوہ بعض رسالوں میں بھی شائع ہوتے تھے۔ میں اپنی میٹرک کی طالب علمی کے زمانے
میں سٹی کالج کے رسالہ " الموسیٰ " کا ایڈیٹر رہا۔ طالب علمی کے اس دور میں مضامین لکھنے کے علاوہ
میرا رجحان شعرگوئی کی طرف بھی تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میٹرک میں مجھے اُردو اور تاریخ و جغرافیہ
سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔

آپ نے مزید کہا کہ تنقیدی مضامین لکھنے کا آغاز بی اے کی طالب علمی کے دور سے ہوا۔
میرے چند تنقیدی مضامین لاہور کے رسالہ " شاہکار " میں شائع ہوتے تھے۔ اس رسالہ کے
ایڈیٹر جناب تاجور نجیب آبادی تھے۔

بی اے کے قابلِ ذکر ساتھیوں کے بارے میں آپ نے کہا کہ مرزا محمد بیگ کے صاحبزادے
مرزا یاسط بیگ اور مرزا فاروق بیگ میرے بی اے کے ساتھیوں میں قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں
آگے چل کر ایچ سی ایس ہوئے۔

میرے ایک اور ہم جماعت نواب داؤد جنگ کے داماد نواب علی حسین خان جاگیردار تھے
یہ فرصت کا زیادہ وقت نظام کلب میں گزارتے تھے۔ پروفیسر محمود حسین (انگریزی) محمد بن عمر
(انگریزی اور اُردو) محمد عمر مہاجر (اُردو) اور عباس علی خاں بھی میرے قریبی اور عزیز ساتھیوں

میں شامل ہیں۔

محمد بن عمر اور عباس علی خاں اپنے دور کے انگریزی کے بہترین مقرر تھے۔ یہ دونوں پروفیسر اسپیٹ کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مرتبہ ان دونوں نے آکسفورڈ سے آئی ہوئی مقررین کی ایک ٹیم کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ آکسفورڈ کی اس ٹیم کے ساتھ آئے ہوئے پروفیسر نے ان دونوں عثمانین کی اعلیٰ تقریری صلاحیت کو زبردست خراج تحسین ادا کیا تھا۔ اس طرح ان دو طلبا نے باہر کی دنیا کے پروفیسر کے سامنے عثمانیہ یونیورسٹی کی نیک نامی، شہرت اور وقار میں اضافہ کیا تھا۔

ہائی اسکول میں ٹیچر اور کالجوں میں لکچرار اردو کی حیثیت سے کارگذار رہنے کے بارے میں صدیقی صاحب نے کہا کہ وہ ٹیچر کی حیثیت سے صرف سٹی ہائی اسکول (سٹی کالج) میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۵ء تک کارگذار رہے۔ جناب سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ بہادر) سٹی کالج کے پرنسپل تھے۔ جناب صدیقی صاحب ۱۹۵۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۵۸ء تک انہوں نے اردو کے لکچرار کی حیثیت سے سٹی کالج میں کام کیا۔ نواب اعظم جنگ بہادر کے بعد جناب احمد حسین خان، ڈاکٹر حسین ظہیر، ڈاکٹر رام لعل اور جناب غیاث الدین احمد سٹی کالج کے پرنسپل ہوئے۔ جز وقتی لکچرار اردو کی حیثیت سے جناب صدیقی نے نظام کالج (ڈے) اور ایوننگ میں بھی کام کیا۔

اپنے ایم اے کے مقالے کے بارے میں جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے بتایا کہ ان کے مقالہ کا عنوان "پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری" تھا۔ اس مقالہ کے سوپروائزر ڈاکٹر زور تھے ایم اے کے زبانی امتحان کے لئے بیرونی ممتحن کی حیثیت سے جامعہ ملیہ (دہلی) کے پروفیسر محمد مجیب صاحب تشریف لائے تھے۔ ایم اے کا پہلا خانگی امتحان صدیقی صاحب نے ۱۹۴۲ء میں بدرجہ دوم کامیاب کیا۔ آپ نے بتایا کہ کالجوں کی ملازمتوں کے دوران آپ نے سیف آباد کالج میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک، سکندرآباد ڈے اور ایوننگ کالج میں ۱۹۶۴ء تک، حیدرآباد ایوننگ کالج میں ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک، آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل میں ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۱ء تک اور حیدرآباد ایوننگ کالج میں ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک کام کیا۔

صدیقی صاحب نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ ۱۹۶۵ء میں ریڈر شعبہ اردو ہوئے تھے اور ۵ر فروری ۱۹۷۴ء کو ریڈر شعبہ اردو کی حیثیت سے وظیفۂ حسن خدمت پر

ان کی تسلیم دستی عمل میں آئی۔

آپ نے بتایا کہ مختلف کالجوں میں کام کے دوران' کئی پرنسپل صاحبان سے ان کا ربط و تعلق رہا۔ اور بفضل خدا ہر پرنسپل نے ان کی خدمات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ سٹی کالج میں لکچراری کے دوران جناب رام لعل پرنسپل تھے' سیف آباد کالج میں لکچرار کی حیثیت سے مامور تھے تو وہاں جناب محمد علی خاں اور ان کے بعد جناب خلیل الرحمن پرنسپل رہے۔ حیدرآباد ایوننگ کالج میں میجر احمدالدین اور پھر مسٹر پی وی راجگوپال پرنسپل رہے۔

آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل کے پرنسپل جناب قادر حسین قریشی اور ان کے بعد جناب گنیش پرشاد جیسوال رہے۔

جناب محمد اکبرالدین صدیقی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سٹی ہائی اسکول و سٹی کالج میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کے دوران انھیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک بدرو کا کالج آف کامرس میں جز وقتی لکچرار اردو کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس کام کی اجازت انھیں سررشتہ تعلیمات نے دی تھی۔ سررشتہ نے سٹی کالج کے پرنسپل جناب رام لعل کی خدمت میں مراسلہ ارسال کیا تھا کہ صدیقی صاحب کو بدرو کا کالج آف کامرس میں جز وقتی لکچرار اردو کی حیثیت سے کام کرنے کی سہولت عطا کی جائے۔

جناب صدیقی نے کہا کہ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں انہوں نے ریڈر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۸ء تک اردو زبان دوم کے طلبا کو اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک ایم اے کی جماعتوں کے طلبا کو پڑھایا ہے۔

آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۴ء تک پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبہ اردو تھے اور ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۴ء کے دوران ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ان کے بعد ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ موجودہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس عثمانیہ یونیورسٹی شعبہ اردو کی صدر رہیں۔

آپ نے بتایا کہ پیشہ کا انتخاب میری مرضی اور پسند کے مطابق ہوا تھا۔ اس لئے درس و تدریس کے اس سلسلے سے مجھے ہمیشہ گہری دلچسپی رہی اور میں نے حتی الامکان محنت' خلوص' انہماک اور احساس فرض کے ساتھ خدمت انجام دی۔

شادی کے بارے میں استفسار پر آپ نے کہا کہ میری شادی ۱۹۲۹ء م ۱۳۳۹ فصلی میں میرے حقیقی چچا جناب محمد خلیل الدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی۔ میرے خسر جناب محمد خلیل الدین

بانگاؤں کے قاضی تھے۔ مجھے دو مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ میں نے پہلا حج ۱۹۷۷ء میں اور دوسرا حج ۱۹۸۰ء میں کیا تھا۔

حیدرآباد سے باہر اپنے سفر کے بارے میں جناب محمد اکبرالدین صدیقی صاحب نے کہا کہ دہلی، کشمیر، مدراس، میسور، بنگلور اور بمبئی کے سفر کا مجھے موقع ملا۔ ایک مرتبہ کیرالا کی کالی کٹ یونی ورسٹی میں میرے احباب جناب احتشام احمد ندوی اور جناب قدرت اللہ صاحب سے ملاقات کے لئے بھی گیا تھا۔ یہ سفر بھی بہت پُرلطف اور یادگار تھا۔

آپ نے کہا کہ میں عثمانیہ یونی ورسٹی کے علاوہ کشمیر یونی ورسٹی میں ایم اے کا ممتحن رہا۔ پانچ سال کے لئے جبل پور یونی ورسٹی کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کا ممتحن رہا۔ اس کے علاوہ مجھے بمبئی یونیورسٹی اور ناگپور یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا ممتحن مقرر کیا گیا تھا۔

مرہٹواڑہ یونی ورسٹی (اورنگ آباد) اور میسور یونی ورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ممبر بھی رہ چکا ہوں۔

عثمانیہ یونی ورسٹی اور اس کے تحت مختلف ڈگری کالجوں میں درس و تدریس کی مصروفیات کے علاوہ، حیدرآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے بھی میرا تعلق رہا ہے۔ اس کی تفصیل بتلاتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں انجمن طیلسانین (گریجویٹس اسوسی ایشن) کا ۱۳۵۶ فصلی گیارہ سال تک معتمد رہا۔ انجمن طیلسانین کی معاشی کمیٹی اور نمائش سوسائٹی کا رکن بھی رہ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ چار سال تک میں مجلہ طیلسانین کا ایڈیٹر بھی رہا۔

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے اپنی دیرینہ وابستگی پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے کہا کہ ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کا اس ادارہ کے قیام سے آج تک بھی معتمد ہوں۔ ۱۹۷۰ء میں ادارہ ادبیات کے شعبہ امتحانات کا معتمد مقرر ہوا اور (۱۲) سال تک اس شعبہ کا معتمد رہا۔ مجھ سے پہلے معتمد شعبہ امتحانات جناب عارف الدین صاحب تھے اور جناب عارف الدین صاحب سے پہلے جناب خواجہ حمیدالدین شاہد، جناب پروفیسر [illegible] اور جناب پروفیسر عبدالقادر سروری نے بھی معتمد شعبہ امتحانات کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ میں دس سال تک ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے ادبی ماہنامہ سب رس کی مجلس مشاورت کا معتمد اور اس رسالہ کا ایڈیٹر رہا۔

۱۹۷۰ء سے اب تک ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا رکن ہوں۔ میرے ایک سوال کے جواب میں جناب صدیقی نے کہا کہ میں نے نوجوانی میں نظمیں بھی کہی تھیں۔ میری یہ نظمیں سب رس کا

کے میگزین "الموسیٰ" اور ایک اور ادبی رسالہ "آئینہ ادب" میں شائع ہوئی تھیں۔ جناب علی احمد جلیلی "آئینہ ادب" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ میری شعر گوئی کا یہ سلسلہ جلد ختم ہو گیا کیونکہ میرا رجحان زیادہ تر تحقیق کی طرف تھا۔ مجھے یاد ہے کہ شعر گوئی کے مختصر سے دور میں جناب فضل الرحمٰن اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی زیر صدارت سٹی کالج میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں "قحط بنگال" پر میں نے ایک نظم سنائی تھی۔ میرے نثری مضامین "شہاب" مجلہ عثمانیہ" سب رس (کراچی) ہندوستانی ادب" سب رس (حیدرآباد) اور نقوش (لاہور) میں شائع ہوئے ہیں۔

جہاں تک نظم و نثر کے مطالعہ کا تعلق ہے شاعری میں غزل اور قصیدہ میری پسندیدہ اصناف ہیں اور نثر میں تنقید" تحقیق اور سفرنامہ مجھے بے حد پسند ہیں اوائل عمر میں افسانہ اور ناول پڑھنے کا بھی شوق رہا لیکن اب اس مشغلہ کے لئے وقت نہیں ملتا۔

آنکھوں میں موتیا بند کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ فی الحال موقوف ہے۔

میں نے سوال کیا کہ کتابوں کی رسم اجرا یا رسم رونمائی کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے ؟ آپ نے جواب دیا کہ میں اس رسم کا کبھی قائل نہیں رہا۔

جناب محمد اکبرالدین صدیقی مشہور رباعی گو شاعر حضرت امجد حیدرآبادی سے بہت قریب رہے ہیں۔ میرے ایک سوال پر آپ نے کہا کہ حضرت امجد حیدرآبادی ہمارے ایک رشتہ دار کے یہاں مقیم رہے ہیں اور امجد صاحب سے ہماری رشتہ داری بھی تھی۔ وہ برسوں محلہ آغاپورہ میں رہے ' جہاں میں بھی برسہا برس سے مقیم ہوں' وہ سررشتہ صدر محاسبی میں ملازم تھے۔ میں انھیں سررشتہ صدر محاسبی کو جاتے ہوئے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے بھی دیکھا کرتا تھا۔

جناب صدیقی صاحب نے بانی ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ڈاکٹر زور کا تذکرہ نہایت ادب و احترام اور احسان مندی کے جذبات کے ساتھ کیا اور کہا کہ محض ڈاکٹر زور کی توجہ دہانی کی بدولت میں نے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور ان ہی کی مسلسل حوصلہ افزائی نے مجھے مصنف بنایا۔ تصنیف و تالیف کے مشغلہ کے بارے میں آپ نے کہا کہ ۱۹۳۸ء م ۱۳۵۵ھ میں میری پہلی کتاب " مشاہیر قندھار دکن " شائع ہوئی۔ ایم اے کا مقالہ "پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری" ۱۹۴۲ء میں لکھا۔ یہ مقالہ دو قسطوں میں مجلہ طیلسانین میں شائع ہوا تھا۔ ادارۂ ادبیات اردو کی فہرست مطبوعات جلد اول کی اشاعت جناب غلام رسول صاحب اور میری مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے ' فہرست مطبوعات جلد دوم اور جلد سوم میں نے مرتب کیں۔

ادارہ کی فہرست مخطوطات جلد اول تا پنجم ڈاکٹر زورؔ نے مرتب فرمائیں۔ فہرست مخطوطات جلد ششم میں نے مرتب کی۔ اس کی کاپیوں کی تصحیح، پروف ریڈنگ اور اس کے اشاریہ (انڈکس) کی ترتیب کا کام ڈاکٹر محمد علی اثر لکچرار عثمانیہ یونی ورسٹی نے انجام دیا۔

دکنیات پر اپنے تحقیقی کام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ میں نے مرزا محمد مقیم مقیمی بیجاپوری کی مثنوی "چندر بدن و مہیار" ۱۹۵۷ء میں ایڈٹ کی اور اسے شائع کیا۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں، میں نے اس مثنوی کو ہندی رسم الخط میں بھی شائع کیا۔ میں نے غواصی کی مثنوی "سیف الملوک و بدیع الجمال" کو ایڈٹ کیا ہے اور ، اردو سے ہندی میں منتقل کیا۔ ہندی کا ایڈیشن دکھنی پرکاشن سمیتی نے شائع کیا۔

ان دو مثنو(یوں) کے علاوہ مرزا جمال اللہ عشق اورنگ آبادی کے دیوان (دیوان عشق) کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۰ء میں شائع کیا۔ حضرت سید شاہ برہان الدین جانمؒ بیجاپوری کی "کلمۃ الحقائق" کو اپنے مقدمہ کے ساتھ جولائی ۱۹۶۱ء میں مرتب اور شائع کیا۔

جناب صدیقی نے بتایا کہ انہوں نے "کشف الوجود" مثنوی سید شاہ داول بیجاپوری خلیفہ حضرت برہان الدین جانم اور اتالیق سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ کو انہوں (صدیقی صاحب) نے ۱۹۶۵ء میں مرتب کرکے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ خاتمہ پر فرہنگ (لغت کشف الوجود) بھی دی ہے۔

جناب محمد اکبر الدین صدیقی نے رسالہ "سب رس" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس رسالے کے بعض اہم خصوصی شمارے مثلاً یادگار نمبر (مئی ۱۹۶۱ء) غالب نمبر (دو جلدوں میں) یادگار ہاشمی (نصیر الدین ہاشمی نمبر) بشیر النساء بیگم بشیر نمبر، یادگار زور (ڈاکٹر زور نمبر) بھی شائع کئے۔ آپ نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے رسالہ "مبصر" کے مرتب ہیں۔ "مبصر" کا تیرھواں شمارہ عنقریب شائع ہوگا۔

۱۹۷۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے خطوط "خطوط عبدالحق" کے نام سے اپنے پیش لفظ کے ساتھ شائع کئے۔ سید محی الدین ابن سید محمود قادری کی فارسی تالیف صحیفہ اہل ہدیٰ (تذکرہ خاندان حضرت سید شاہ ابوالحسن قادری بیجاپوری) کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا اور ستمبر ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ آپ نے حضرت برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ ۱۹۷۱ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے لکھا تھا۔

آپ نے بتایا کہ لچھمی نرائن شفیق کے تذکرۂ شعرائے فارسی (کہ از ایران بہ ہند آمدہ بودند) "شام غریباں" کو ۱۹۷۷ء میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ یہ تذکرہ خوبصورت ٹائپ میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا۔ اس میں "حرفے چند" کے زیر عنوان جناب جمیل الدین عالی معتمد اعزازی انجمن ترقی اردو پاکستان کی تحریر اور جناب صدیقی کا نوشتہ "مقدمہ" شامل ہیں۔

جناب صدیقی نے میر نظام الدین ممنون دہلوی کے کلیات جلد اول (قصائد) کو مارچ ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

مکتبہ جامعہ (نئی دہلی) کے زیر اہتمام آپ نے کلیات محمد قلی قطب شاہ کا "انتخاب" اپنے مقدمے کے ساتھ ستمبر ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

حضرت سید محمد بے نظیر شاہ وارثی بے نظیر کے مجموعہ "کلام بے نظیر" کو آپ نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مرتب کیا۔ دکنی ادب پر آپ کے (۲۳) مضامین کا مجموعہ "بجھتے چراغ" نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا۔

محمد عبدالرحمن بارکر اور شاہ عبدالسلام نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی کی اعانت کے ساتھ "نقش دل پذیر" جلد اول (A READER OF CLASSICAL URDU POETRY.) ۱۳۹۶ھ میں شائع کی۔ اس کتاب میں اردو کے (۲۳) ممتاز شعراء کے کلام کا انتخاب اور ان کی مختصر سوانح ہے۔ اس کتاب کے (PREFACE) میں محمد عبدالرحمن بارکر نے جناب صدیقی کی ادبی خدمات کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے۔ "ONE OF THE ACKNOWLEDGED EXPERTS ON DAKKANI URDU." یہ کتاب یعنی "نقش دل پذیر" انگریزی مادری زبان والوں کے لئے جو اردو پڑھتے ہیں، مرتب کی گئی اور نیویارک (امریکہ) سے شائع ہوئی ہے اس میں لکھا ہے کہ کتاب کی تحقیق و تدوین، محکمۂ صحت، تعلیم و بہبود حکومت ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مالی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔

جناب صدیقی حیدرآباد سے باہر کے معیاری رسالوں کی خصوصی اشاعتوں کے لئے مضامین اور مواد بھیجتے رہے ہیں۔ جناب مالک رام کے رسالہ "تحریر" (دہلی) کے کالم "وفیات" کے سلسلے میں آپ نے حیدرآباد کے مرحوم شاعروں اور ادیبوں سے متعلق ضروری مواد ارسال کیا۔

مجلس ترقی ادب لاہور نے مقالات سرسید کی سولہ جلدیں شائع کیں۔ جناب صدیقی نے بتایا کہ انھوں نے ان جلدوں میں اشاعت کے لئے حیدرآباد سے سرسید احمد خاں کی ۱۸۷۸ء میں تصنیف کی ہوئی کتاب "قدیم نظام دیہی ہندوستان" بھیجی تھی جسے مقالات سرسید حصہ شانزدہم میں شائع

کیا گیا اور اس جلد میں جناب صدیقی کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔

نقوش (لاہور) نے جناب صدیقی کے حیدرآباد سے بھیجے ہوئے میر تقی میر کے فارسی دیوان کی فوٹو کاپی ۱۹۸۲ء میں شائع کی۔ "نقوش" کے اس نمبر میں "میر کی فارسی شاعری" پر جناب صدیقی کا مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ صدیقی صاحب نے "نقوش" کے مثنوی نمبر کے لئے حیدرآباد سے دس بارہ مثنویاں ارسال کی تھیں۔ مثنوی نمبر ابھی شائع نہیں ہوا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے شائع شدہ "مرقع سخن" جلد اول اور جلد دوم میں محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے چار چار شعرا کے بارے میں مضامین لکھے تھے۔ ناگپور کے (ARCHIALOGIA INDICA) میں بھی آپ کے مضامین شائع ہوئے تھے۔

حیدرآباد کے اسکولوں کے لئے صدیقی صاحب نے درسی کتابیں بھی مرتب کی تھیں اس کے علاوہ، مرہٹواڑہ اور کیرالا یونی ورسٹی کے تحت ہائی اسکولوں کے لئے اور میسور میں انٹرمیڈیٹ کے لئے آپ کی مرتب کردہ نصابی کتابیں پڑھائی جاتی رہی ہیں۔ حیدرآباد میں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۶ء اور مرہٹواڑہ میں ۱۹۵۶ء میں اور کیرالا میں ۱۹۶۰ء میں یہ کتابیں نصاب میں شامل کی گئی تھیں۔

۱۹۷۸ء میں پرنسٹن ' نیوجرسی (امریکہ) سے رچرڈ میکسول ایٹن نے SUFIS OF BIJAPUR (1300 — 1700) شائع کی تھی۔ اس کتاب کی تدوین میں جناب صدیقی صاحب نے بھی مرتب کو مفید مشورے دیئے تھے۔ جس کا رچرڈ میکسول ایٹن نے اپنے (PREFACE) میں شکریہ ادا کیا ہے۔

دکھنیات میں صدیقی صاحب کا ایک اور کارنامہ ابن نشاطی کی "پھول بن" کی اشاعت ہے اس میں آپ کا مقدمہ اور آپ کی مرتبہ فرہنگ بھی شامل ہے۔ یہ مثنوی ترقی اردو بیورو ' نئی دہلی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔

میں نے صدیقی صاحب سے یہ خواہش بھی کی تھی کہ ملازمت کے دوران کا کوئی یادگار واقعہ ہوا ہو تو اس کا تذکرہ بھی ہو جائے۔ اس سلسلے میں آپ نے کہا کہ میری ملازمت کے ابتدائی دور میں سٹی کالج میں ولی اورنگ آبادی کا جشن منایا گیا۔ اتنے بڑے اور شاندار پیمانہ کا جشن ' میں نے کبھی نہیں دیکھا ' اس جشن یادگار ولی کی سرپرستی نواب یوسف علی خاں سر سالار جنگ سوم نے فرمائی تھی۔ اس سلسلے میں پہلی بار بڑے پیمانے پر دکنی مخطوطات کی نمائش بھی ترتیب دی گئی تھی جس کے لئے کتب خانہ' سالار جنگ ' کتب خانہ آصفیہ (موجودہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری ' حیدرآباد) سے دکنی مخطوطات حاصل کئے گئے تھے۔ آغا حیدر حسن نے بھی اس نمائش کے لئے اپنے ذاتی کتب خانہ سے دکنی مخطوطات

عنایت کئے تھے۔ یادگار ولی کے انعقاد کے سلسلے میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر سید محمد نے بہت سرگرمی سے حصّہ لیا تھا۔ جناب علیم الدین تاجر کتب، نے اپنی طرف سے دیوان ولی کے بعض نسخے نمایش میں رکھے تھے۔ ولی کے متعدد دیوان، نمایش میں جمع ہو گئے تھے۔ یادگار ولی کے سلسلے میں منعقدہ بعض اجلاسوں میں نواب بسالت جاہ اور نواب اعظم جاہ بہادر نے بھی بہ نفس نفیس شرکت فرمائی تھی۔ صدیقی صاحب اس زمانے میں سٹی کالج کے ہائی اسکول سکشن میں ٹیچر تھے۔ سٹی کالج کے میگزین "المویٰ" کا "یادگار ولی نمبر" بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا تھا۔ یادگار ولی کے ایک اجلاس میں نواب سالار جنگ نے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے قیام کا اعلان فرمایا۔ صدیقی صاحب سے میں نے ان کی طالب علمی کے دور کے کسی دلچسپ یا یادگار واقعہ کی یاد تازہ کرنے کی درخواست کی تو آپ نے کہا کہ نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کی سلور جوبلی کا زمانہ تھا۔ یونی ورسٹی کے طلبا نے جوش و خروش کے ساتھ امتحانات کے ملتوی کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس زمانے میں مسٹر میکنزی، پرو وائس چانسلر عثمانیہ یونی ورسٹی تھے۔ طلبا سے ان کا سلوک مشفقانہ رہا۔

انٹرویو کے آخری تین سوالوں میں سے ایک سوال تھا۔ آپ نے اپنی سوانح عمری لکھنے کے بارے میں بھی کبھی سوچا ہے؟

صدیقی صاحب نے اس سوال کا نفی میں جواب دیا اور کہا میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے۔

میرا ایک اور سوال تھا۔ کیا وہ سب کام پایۂ تکمیل کو پہونچ گئے جنھیں آپ کرنا چاہتے تھے؟ آپ نے کہا کہ کبھی کوئی خاص پروگرام پیش نظر نہیں رہا۔ میں ایک ٹیچر تھا اور ٹیچر (بگ بوچیٹے تو) بڑے خواب کبھی دیکھ نہیں سکتا۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اور اردو زبان و ادب کی خدمت مجھ سے جس قدر بھی ہو سکی اس میں ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی مدد میرے شامل حال رہی۔ میرے اس سوال کا جواب آپ نے میر تقی میر کا یہ شعر پڑھتے ہوئے دیا ؂

کام تھے عشق میں بہت سے میر   ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

آخر میں صدیقی صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں نے درخواست کی کہ وہ "نئی نسل" کے نام کوئی پیام عنایت فرمائیں۔ صدیقی صاحب نے کہا کہ کام اور پیشہ میں لگن کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ ہر معاملہ میں دیانت داری بے حد ضروری ہے۔ تحقیق اور ادبی معاملات حوالوں کی صراحت اسکالر اور ادیب کا اخلاقی فریضہ ہے "جس پر نظر رکھنی چاہیے۔" ●

محمد اکبر الدین صدیقی

شامِ غریباں
ایک نادر مخطوطہ

لچھمی نراین شفیق کے اجداد کا تعلق لاہور سے تھا۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر کے ہمراہ دکن آئے اور اورنگ آباد کو وطن بنالیا۔ ان کے والد رائے منارام مآثر نظامی کے مصنف تھے۔ شفیق نے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں۔ اورنگ آباد میں کئی تذکرے لکھے گئے لیکن شفیق کے بارے میں کسی نے نہ لکھا۔ اس لیے کہ تذکروں کی تالیف کے وقت وہ ابھی بیس سال کے بھی نہ ہوئے تھے۔ نتائج الافکار (۱۲۵۸ھ) کے مصنف نے شفیق [illegible] اور فارسی کلام کا نمونہ دیا ہے اور ان کے تذکروں گلِ رعنا اور شامِ غریباں کا ذکر کیا ہے ۱۳۲۹ھ میں "تذکرۂ شعرائے دکن" شائع ہوا۔ اس میں عبدالجبار خاں ملکاپوری نے ان دونوں تذکروں کے علاوہ چمنستان شعرا کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ مآثر آصفی، مآثر حیدری، بساط الغنائم، مرآت الہند، نگارستان و تذکرۂ بابا گرونانک کے نام دے کر وغیرہ لکھ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ شفیق نے اور بھی کتابیں ضرور لکھی تھیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے جب ۱۹۲۸ء میں چمنستان شعرا شائع کیا تو شامِ غریباں کے بعد گلِ رعنا کا تذکرہ کیا۔ اور دیگر تصانیف میں حقیقت ہائے ہندوستان، تنمیق شگرف اور حالات حیدرآباد کا اضافہ کیا ہے۔ ہاشمی مرحوم نے شفیق کی ایک مثنوی تصویرِ جاناں کا تعارف رسالہ تجلی حیدرآباد کے ذریعہ کرایا جو بعد کو مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کی طرف سے شائع ہوئی ہے لیکن اس کے مقدمے میں شفیق کی کسی نئی کتاب کا ذکر نہیں۔ البتہ شفیق کا سنہ وفات ۱۲۲۳ھ دیا ہے۔ یوسف علی خاں صاحب آج کل مآثر آصفی کی تدوین میں مصروف ہیں۔ صاحب موصوف نے شفیق کی مزید پانچ کتابوں یعنی خلاصۃ الہند، امرت کنڈ، سوسن و سنبلستان، مثنوی اقسام نسواں اور تحفۃ الاحباب کا پتہ چلایا ہے۔ یا تو کتابیں ملی ہیں یا ان کے نام۔ عبدالرزاق صاحب قریشی مالک کتب خانہ درگاہ یوسفین کے کتب خانہ میں شفیق کا ایک کشکول یا بیاض تھی جس کو انھوں نے چمنستان اشعار کا تاریخی نام دیا تھا۔ یہ مختلف شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ کتب خانہ سالار جنگ میں "خرقۂ صد پارہ" نام کی ایک کتاب فارسی میں پند و نصائح پر شفیق کی تصنیف

ملتا ہے پروفیسر سید محمد نے اپنے مضمون "چمنستان شفیق" میں ان ناموں کے علاوہ کسی اور کتاب کا نام نہیں دیا۔ شام غریباں کے مطالعہ سے اس فہرست میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہوتا ہے۔ شفیق کے الفاظ میں:

"مخفی نماند کہ بندہ شفیق جواہر زواہر نام کتاب مستقل پنج ہزار بیت در مناقب آنجناب (میر غلام علی آزاد بلگرامی) بقید کتابت آوردہ ام۔" اس کتاب کا آج تک کوئی نسخہ دریافت نہ ہو سکا اس کے بعد اس کے اردو اور فارسی علیحدہ علیحدہ دیوان ہیں اس طرح اس کی تصانیف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

چمنستان شعرا[1]، گل رعنا[2]، شام غریباں[3]، مآثر آصفی[4]، مآثر حیدری[5]، بساط الغنائم[6]، مرات الہند[7]، حقیقت ہائے ہندوستان[8]، تحقیق شگرف[9]، حالات حیدرآباد[10]، خلاصۃ الہند[11]، امرت کندہ[12]، تحفۃ احباب[13]، تذکرہ ہا بالگرو نانک[14]، نخلستان[15]، سوسن دہ زبان[16]، مثنوی اقسام نسواں[17]، چمنستان اشعار[18]، خرقہ صد پارہ[19]، جواہر زواہر[20]، دیوان فارسی[21]، دیوان اردو[22]، شام غریباں میں ایسے شعرا کا تذکرہ ہے جو ایران سے ہندوستان آئے اور بابر بادشاہ سے لے کر محمد شاہ، شاہ عالم تک کے درباروں میں باریاب ہوئے اور دکن میں بہمنی دربار میں اور پھر اس کی جانشین سلطنتوں یعنی نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی درباروں سے متوسل رہے۔ بعض ایسے شعرا بھی ہیں جنھیں کسی دربار میں باریاب ہونے کا موقع نہ ملا یہ شعرا یا تو یہاں رہ بس گئے یا واپس چلے گئے۔

اس مخطوطہ کے دو اور نسخوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک علی گڈھ میں انجمن کے کتب خانے میں ہے اور دوسرا اورینٹل کالج لاہور کے کتب خانے میں۔ انجمن کا نسخہ اول و آخر ناقص ہے اور لاہور کا نہ صرف اول و آخر ناقص بلکہ آب زدہ بھی ہے اور اکثر جگہ پڑھنا مشکل ہے اس طرح میرے پیش نظر جو نسخہ رہا وہ مکمل اور نہایت عمدہ حالت میں ہے۔ اس کی کوئی نقل بانکی پور، رام پور اور بمبئی میں یا حیدرآباد کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ اس لیے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

اس تذکرہ میں جملہ ۲۸۳ شعرا کا ذکر ہے یہ تعداد مکمل نہیں کہلائی جا سکتی اس لیے کہ دکن ہی میں کئی ایسے شعرا کے نام ملتے ہیں جو دکن کے درباروں سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ لیکن اکثر تذکرے ان کے بارے میں خاموش ہیں۔ شفیق نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے یہ تذکرہ تالیف کیا۔ اس کی تالیف کے وقت متعدد تذکرے اور کتب تواریخ زیر مطالعہ رہے ہیں جن کا اس نے نہایت دیانت داری سے حوالہ دیا ہے۔ چند تذکرے اور تاریخ کی کتابیں حسب ذیل ہیں۔

تذکرہ طاہر نصیرآبادی، مجمع النفائس۔ آرزو۔ تذکرہ صبح صادق میرزا صادق۔ تذکرہ نظم گزیدہ ناظم تبریزی، میخانہ قزوینی، مراۃ الخیال، شیر خان لودی، کلمات الشعرا محمد افضل سرخوش، عرفات العاشقین تقی الدین اوحدی اور اپنے استاد میر غلام علی آزاد کے تذکرے ید بیضا، خزانۂ عامرہ، سرو آزاد اور غزلان الہند، یہ سب تذکرے آج ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔ ان میں بعض طبع ہونے

کے باوجود بھی بیحد کمیاب ہیں۔ تاریخی کتب میں امین رازی کی ہفت اقلیم اور ابوطالب کلیم، محمد صالح اور عبدالحمید لاہوری کے شاہجہاں ناموں یا شاہنشاموں کا ذکر ملتا ہے۔

متذکرہ بالا تذکروں کے علاوہ اس میں ایک اور تذکرہ "مرات واردات" کا حوالہ موجود ہے اس کا مصنف شاہ محمد شفیع نگینی ہے۔ یہ نگینہ ڈاکٹر نذیر احمد خاں کا وطن ہے۔ اس تذکرہ کا نہ کسی اور تذکرہ نگار نے حوالہ دیا ہے نہ کہیں اس کا نام مخطوطات کی فہرست میں نظر سے گذرا۔ غالباً یہ ناپید ہو چکا ہے۔ اس کے حوالے سے جو باتیں شفیق نے بیان کی ہیں وہ کسی اور تذکرہ میں نہیں ملتیں۔

شفیق نے ایک خاص اہتمام یہ بھی کیا ہے کہ شعراء نے جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں، ان کے نام دے دیئے اگر انھوں نے کہیں سفر وغیرہ کیا ہو تو اکثر بقید سن اس کا ذکر کیا ہے۔

ہمارے محققین نے شفیق کے حالات بیان کرتے ہوئے چمنستان کے بعد شام غریباں ہی کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد گل رعنا کا۔ اس سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شام غریباں گل رعنا پر مقدم ہے لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ چمنستان کو شفیق کے لڑکپن کی کارگزاری سمجھئے کہ وہ ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوا اور اٹھارہ سال کی عمر میں ۱۱۵۵ھ میں لکھا اور اس کے چھ سال بعد یعنی اپنی عمر کے چوبیسویں سال ۱۱۸۱ھ میں گل رعنا لکھا اور شام غریباں اس کے سولہ سال بعد ۱۱۹۷ھ میں تصنیف کیا۔ اس نے اپنی اکثر کتابوں کے نام تاریخی رکھے اور جن کا نام تاریخی نہیں خاتمہ پر ان کا قطعۂ تاریخ دے دیا ہے۔ چنانچہ شام غریباں کا نام متن کے اعتبار سے نہایت موزوں تھا لیکن اس میں تاریخ نہیں نکل سکی اس لیے قطعہ لکھ کر "اتمام نسخہ" (۱۱۹۷ھ) سے اس کی تاریخ نکالی ہے۔ تذکرہ کی تکمیل کے بعد اس نے اپنے اُستاد آزاد بلگرامی کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے اور بہت طول طویل انتخاب کلام دیا ہے۔ حالات کے بعد آزاد بلگرامی کے چند قطعات تاریخ دیئے ہیں جس سے مزید اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۱۹۷ھ میں مکمل ہوا ہے۔ آزاد نے میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت پر تاریخی قطعہ لکھا ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے شفیق لکھتے ہیں کہ مظہر جان جاناں کو کسی نامعلوم شخص نے ۷ محرم ۱۱۹۵ھ کو جہاں آباد میں زخمی کر دیا اور اسی زخم سے وہ یوم عاشورہ کو انتقال کر گیے اور اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے۔ آزاد نے تاریخ کہی

میرزا مظہر سخن تیغ شہید   حشر او با نور چشم فاطمہ

روز عاشورہ از جہاں مظلوم رفت   گفتہ شد تاریخ "حسن الخاتمہ" (۱۱۹۵)

اسی سال نورالعین واقف بٹالوی نے بھی جہاں آباد ہی میں رحلت کی[۱] اور آزاد نے اس طرح تاریخ کہی۔

---

[۱] نیاز احمد لیتھی نے نسخۂ عندلیب کے حوالے سے اور سید صاحب قاموس المشاہیر نے تاریخ وفات ۱۱۹۰ درج کی ہے۔ اسپرنگر نے بھی اسی کا اثبات کیا ہے۔

افسوس کہ واقف سخن سنج　　طومار حیات خویش پیچید

تاریخ وفات او خرد گفت　　"واقف بجہان خلد گردید"

۱۱۹۵ھ

اس کے بعد شفیق لکھتے ہیں "سر آمد شعرائے ریختہ" میرزا رفیع سودا نے بھی ۴ رجب کو رحلت کی تو آزاد نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ کہا۔

مرزا سودا رفیع عالی فطرت　　آرام گرفت در جوار رحمت

تاریخ وفات او رقم زد آزاد　　سودا آسود شادماں در جنت

اور ان قطعات کے بعد آزاد نے ان تینوں کے لیے ذیل کا ایک قطعہ کہا ہے:-

سہ سخن سنج ہند دریک سال　　کوچ کردند باہم از دنیا

میرزا مظہر خدا آگاہ　　سخن او تمام درد و صفا

نادر العصر شیخ نور العین　　یک قلم کرد سخن را احیا

میرزائے بلند رتبہ رفیع　　در سخن صاحب ید بیضا

ہر سہ با بندہ آشنا بودند　　حیف رفتند در مقام فنا

بہر تاریخ فوت این یاراں　　کرد آزاد مطلعی انشا

جان جاناں و واقف و سودا　　۴۲۹

وار و آشیانۂ ملک بقا　　۷۶۶ -

۱۱۹۵

ان قطعات کی روشنی میں ۱۱۹۷ھ "اختتام نسخہ" کی صورت مسلّم ہے۔

شفیق کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے بزرگ استاد میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکروں سے استفادہ کیا ہے بلکہ یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ یہ آزاد ہی کی تصانیف ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں جب ہم شام غریباں کا مطالعہ کرتے ہیں تو منجملہ ۴۸۲ کے صرف ۳۲ شعراء میں بعض شعراء کے کلام کا انتخاب شفیق کا اپنا ہے اور بعض شعرا کا آزاد سے لیا ہوا اور حالات کی عبارت میں قدرے یکسانیت نظر آتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ شفیق جو نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے اور پھر ان کے بیٹے عالی جاہ کے دربار سے متوسل رہے اپنے مربی کے ساتھ ۱۱۷۷ھ میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدرآباد آئے اور پھر حالات کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہیں اورنگ آباد جانے کا موقع نہ ملا۔ اور ۱۲۲۳ھ میں انہیں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ البتہ آزاد مختصر سے قیام کے لیے ایک دفعہ ۱۱۸۶ھ اور دوسری دفعہ ۱۱۹۵ھ میں

جب کہ ان کا سن اسّی سال کا ہو چکا تھا حیدرآباد آئے اور پھر اورنگ آباد واپس ہو کر ۱۲۰۰ھ میں انتقال کیا۔

شامِ غریباں اور گلِ رعنا اور سرو آزاد کے تذکروں کا مقابلہ بھی اس فرق کو واضح کرو سے کا جو استاد اور شاگرد کے اندازِ بیان اور زبان میں موجود ہے۔ اس میں استاد اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ ادیبانہ شان میں نظر آتے ہیں اور رشا گرد شاگردی میں۔

شامِ غریباں کا آغاز آدم علیہ السلام کے تذکرے سے ہوا ہے اور توجیہ یہ کی ہے کہ وہ جنت سے ہندوستان آئے اسی تعلق سے مختلف مذاہب میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کے حوالے دیئے ہیں ان کے علاوہ علماء اور شعراء نے بھی جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں بھی پیش کر دیا ہے۔ ان میں شیخ جلال الدین سیوطی، ناصر علی سرہندی، شیخ علی رومی صاحب محاضرۃ الاوائل اور شعراء میں امیر خسرو، میرزا صائب، اور آزادی بلگرامی کے اشعار دیئے ہیں۔ حرف الف میں (۱۵) شعراء کے حالات ہیں جن میں حکیم صدر الدین عالی، ابوالفتح گیلانی اور قزلباش خاں امید وغیرہ شامل ہیں۔ میر رضی شوستری اقدس کے حالات بیان کرتے ہوئے متعلقہ تاریخی واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں۔ اکثر شعراء کے انتقال کی تاریخیں یا معاصرین کے قطعات تاریخ بھی دیئے ہیں۔

حرف ب کے تحت صرف میرزا عبدالقادر بیدل کا ذکر ہے اور شفیق خود ہی معترف ہیں کہ ان کا شمار واردانِ ہند میں نہیں۔ ان کا حال دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے اور گلِ رعنا میں بھی خود انہوں نے لکھا ہے لیکن یہاں ان حالات کو شامل کرنے کا مقصد یہ بیان کرتے ہیں۔

> "دریں ایام "مرآت واردات" تالیف شاہ محمد شفیع تکلمی متخلص بہ وارد طہرانی بہ نظر رسیدہ۔ دریں کتاب بعضی احوال میرزا سودای آن است کہ در تذکرہ ہا بہ نظر نہ رسیدہ۔ تالیف شاہ وارد غیر مشہور است لہٰذا بہ خاطر رسید کہ میرزا صاحب کمال عمدہ است۔ ترجمہ او را بہ احوال زاید کہ شاہ وارد آوردہ باید نوشت تا بر صفحۂ روزگار باقی ماند۔"

تمام تذکرے بجز ایتھے اور قاموس المشاہیر[1] کے اس امر پر متفق ہیں کہ بیدل عظیم آباد میں پیدا ہوئے اور اعظم شاہ کے دربار سے متوسل رہے اور جب اس نے اپنی مدح میں قصیدہ کہنے کے لیے کہا تو ملازمت ترک کر دی، لیکن وارد اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

> "طائرِ خوشنوای وجود میرزا از گلستانِ عدم در اکبر نگر عرف راج محل از ممالک

---

[1]: ایتھے نے اکبرآباد اور صاحبِ قاموس نے بخارا لکھا ہے۔

بنگالہ پر پرواز کشود و مدتی دراں سرزمین معاش بہ جمعیت بسر برد و در کمال جوانی رو بہ ہندوستان آورد و نخست در صحبت میرزا سلیمان، خالوی حقیقی سلطان محمد معزالدین خلف شاہ عالم بن عالمگیر سالہا بسر برد و بعد فوت میرزا سلطان در سلک ملازمان اعظم شاہ بن عالمگیر منسلک گشتہ بیت الغزل دیوان اعتبار گردید۔"

اس بیان کو اس لیے غلط نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد کا بیان اور تعجب خیز نظر آتا ہے جب اعظم شاہ نے بیدل سے اپنی مدح میں قصیدہ لکھنے کے لیے کہا تو بیدل نے ملازمت ترک کر دی اور شاہ وارد لکھتے ہیں کہ:

"پس از قطع منازل در بلدۂ متھرا بر کنار دریا سے جمن اقامت گزید۔ لعل محمد نامی حاکم آن مکان نائب حسن علی خاں بہادر والہ وردی خانی از قدوم میرزا اطلاع یافتہ در دل جوی و خاطر داری کوشید۔ میرزا نیز دلدادۂ صحبت اوشد، اتفاقاً سلطان عالمگیر کہ در دکن بود لعل محمد را بحضور خود طلبید۔ لعل محمد موجب حکم بادشاہ جبراً و قہراً رو بہ مہلکہ سفر دکن آورد و عرض راہ سمند عزیمت را اقلیم عدم جلوریز ساخت۔ میرزا تا مدت یک و نیم سال در خانۂ راقم ایں اوراق بی تشویش معاش اصل اقامت افگند۔"

غرض اسی طرح اس تذکرے کے مطالعہ سے بعض نئی معلومات ملتی ہیں۔

کلیات علی عادل شاہ ثانی میں ایک غزل کا عنوان چہار در چہار ہے۔ یہ اصل میں سولہ رکنی بحر ہے اس کا نام بھی شاہ وارد کے تذکرہ میں موجود ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

"در بحر کامل چہار در چہار اول شاعری کہ شعر موزون کرد ادیب صابر است و او غزلی بیش از ہفت بیت مرقوم نہ ساختہ و بعد از ادیب صابر مولانا عبدالرحمن جامی غزل ہفدہ بیت ایجاد نمود میرزا بیدل در بحر کامل چہار در چہار دیوانی مشحون بہ معانی خاص و مضامین عالی تصنیف کردہ۔"

صابر کا شعر حسب ذیل ہے:

چنیں شنیدم کہ لطف یزداں بروی جوئندہ ورنہ بندد دری کہ بکشاید از حقیقت براہل عرفان دگر نہ بندد

شفیق اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاہ وارد خبر ندارد کہ مطلعی کہ از ادیب صابر نقل کردہ بحر کامل نیست بلکہ از فروع بحر متقارب است۔ تقطیعش فعول فعلن، اس قسم کی تنقیدیں تذکرہ میں اکثر مقامات پر ہیں کہیں الفاظ کی تحقیق پر بحث کی ہے اور کہیں معانی و بیان کی نزاکتوں کو پیش کیا ہے۔ اس سے شفیق کی صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

جس طرح شفیق نے آدم علیہ السلام کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان آئے اسی طرح شیخ سعدیؒ

کے بارے میں بھی لکھا اور ثبوت کے لیے دو شعر پیش کیے ہیں۔

تبی دیدم از حاجی در سومنات ۔۔۔ مرصع چو در جاہلیت منات

بہ ہند آمدم من از آن رستخیز ۔۔۔ وز آنجا براہ یمن تا حجیز

تاریخی واقعات کے اظہار کے لیے ایسے شعرا کے حالات جن کا شاہی درباروں سے تعلق رہا ہے مطالعہ کیا جائے تو بہت سی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں میر جملہ روح الامین' سلیم' سرمد' ظہوری انیسی شاملو' میر جملہ محمد سعید' شہرستانی' قدسی' میر رضی دانش وغیرہ شامل ہیں' اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی زندگی بالکل سپاہیانہ گزاری لیکن بیس بائیس شعرا ایسے ہیں جو عالمگیری امرا یا خود عالمگیر کے دربار سے وابستہ رہے۔ نعمت خان عالی جیسا شاعر اور ادیب اسی دربار میں رہا۔

شفیق نے بعض شعرا کی قبروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ چنانچہ سلیم کے متعلق لکھتا ہے کہ :

"درسالی کہ اسلام خاں (وزیر شاہ جہاں) فوت شد (سلیم) ہم در کشمیر چشم از زندگانی پوشید و در دامن کوہی کہ مشہور بہ تخت سلیمان مشرف بر تالاب دل بہ رخ وال جلہ مدفون گردید۔"

طغرای مشہدی کے متعلق لکھتا ہے کہ :

"اواخر حال گوشہ انزوا در کشمیر گرفت و جہان جاودر گزشت و نزدیک قبر ابو طالب کلیم مدفون گشت۔"

لیکن پتہ نہیں کہ قدسی کے بارے میں شفیق نے کون سا تذکرہ پیش نظر رکھا غالباً ملا عبدالحمید لاہوری کا شاہجہاں نامہ ہوگا کیوں کہ اس کے متعلق وہ لکھتا ہے۔

"ودر لاہور سنہ ست و خمسین والف بعالم قدس خرامید۔"

حالانکہ غنی کشمیری کا قطعہ تاریخ قدسی' سلیم اور کلیم کا مدفن ایک قرار دیتا ہے اور سرو آزاد میں یہ موجود ہے۔ اس کے آخری تین شعر یہ ہیں :

عمر ہا در یاد او زیر زمین ! ۔۔۔ خاک بر سر کردہ قدسی و سلیم

عاقبت از اشتیاق یک دگر ۔۔۔ گشتہ افزایں ہر سہ در یکجا مقیم

گفت تاریخ وفات او غنی ۔۔۔ طور معنی بود روشن از کلیم

اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شفیق نے تحقیق کی زحمت گوارا نہیں کی اور جہاں سے جو اور جیسا مواد فراہم کر کے پیش کرتا چلا گیا۔ چمنستان شعرا کے مواد کے بارے میں بھی مولوی عبدالحق صاحب کو شکایت ہے کہ اس نے ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ کو جو بلحاظ صحت واقعات درخور اعتنا نہیں '

اہمیت دی اور اسی کو ماخذ بنایا لیکن چمنستانِ شعراء کا مصنف صرف اٹھارہ سال کا لڑکا ہے اور شام غریباں کا مصنف تقریباً ۷۰ سال کو پہنچ چکا ہے اس لیے اس سے تحقیق و تلاش کی توقع کی جا سکتی تھی۔

کلیم کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"وفات کلیم پانزدہم ذی الحجہ سال ہزار و شصت و یک ہجری واقع شدہ و در نزدیکی قبر محمد قلی سلیم مدفون گردید۔"

نعمت خان عالی کی قبر کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"اتفاقاً نعمت خان بعد وصول حیدرآباد در رکاب شاہ عالم بہادر جادر سنہ احدی وعشرین ومائۃ والف رحلت کرد و در دائرہ میر محمد مومن مدفون شد و بر سر قبرش مسجدی ساختہ اند کہ بالفعل موجود است۔"

میر رضی اقدس شوستری کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

"آخر الامر در بلدۂ حیدرآباد گوشۂ انزوا گرفت و متاہل شد و بست و دوم جمادی الاولیٰ سنہ اربع وتسعین [۱۱۹۴] ومائۃ الف رحلت نمود و در دائرہ میر محمد مومن استرآبادی مدفون گردید۔"

میر ابو تراب فطرت والد میر رضی دانش کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ:

"ابو تراب در سنہ ستین والف در نقاب تراب رفت۔ میر آزاد در سرو آزاد گوید کہ قبر او در دائرہ میر محمد مومن استرآبادی کہ گورستان معقول ایرانیان است و مردم بسیاری از آں ولایت دراں بقعہ خوابیدہ اند دیدہ شد۔ بر لوح مزار او کندہ اند کہ ایں رباعی را دم آخر بنظم آورد .... در رباعی دیگر است میر رضی کہ در فراق والد خود گفتہ ہم بر لوح مزار تحت رباعی مذکور نقش است۔"

پھر اس کے بعد شفیق نے لکھا ہے کہ:

"میر آزاد سلمہ اللہ تعالیٰ با بندہ فرمودند کہ در سنہ خمس وستین [۱۱۶۵] ومائۃ والف ورود حیدرآباد اتفاق افتاد و بدلالت میر رضی اقدس شوستری قبر میر ابو تراب در دائرہ میر دیدہ شد۔ دراں وقت دائرہ مذکور ویرانہ بود و اثری از آبادی نداشت پس از آں بعد سی سال در سنہ خمس وتسعین [۱۱۹۵] ومائۃ والف باز ورود حیدرآباد ورود نمود و دائرہ میر ملاحظہ کردم اثری از قبر و لوح میر ابو تراب نیافتہ شد و ہم چنیں اکثر

قبورکہ درآں قطعہ زمین بود با خاک برابر گشت۔ سببش ایں کہ درزمان حال بنا بر سکونت والیٔ ملک نواب نظام الدولہ آصف جاہ ثانی خلف الصدق نواب نظام الملک آصف جاہ خدیو دکن آبادیٔ حیدرآباد بحد کثرت رسیدہ و ایں دائرہ کہ تمام خوابگاہ موتی بود آرامگاہ احیا گردیدہ۔"

شفیقؔ نے اپنی زبان کو نہایت سلیس اور عام فہم رکھا ہے۔ مقفّیٰ اور مسجّع لکھنے کی کوشش نہیں کی البتہ شاعروں کے تخلص کی مناسبت سے ان کا کلام دیتے ہوئے عبارت آرائی ضرور کی ہے مثلاً: روغن استرآبادی کے لیے روغن قاز بروی سخن می مالد۔ رونقی کے لیے او سخن را رونق می دہد۔ شالور کے لیے او تصویر سخن می کشد۔ سیف الملوک شجاعی دماوندی کے لیے۔ ایں جواہر از آں شمشیر است۔ مولانا صادق حلوای کے لیے او حلوای سخن می فرو شد اور غزالی مشہدی کے لیے این چند شگوفہ از غزالی است۔

اس اسلوب سے قاری کا ذہن بار محسوس نہیں کرتا اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

اس کی تنقید میں ابتدا سے آخر تک کہیں دل آزاری نہیں پائی جاتی۔ بلکہ جو واقعہ جس انداز میں بیان کرنا چاہیے اسی انداز میں پیش کر دیتا ہے ورنہ اکثر تذکرہ نگاروں نے تلخ گوئی کو اپنا شعار بنایا ہے یہ تلخی بعض جگہ آزاد کے تذکروں میں بھی نظر آ جاتی ہے۔

یہ تذکرہ مذکورہ پیش کردہ خصوصیات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے اور فارسی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے کہ بیرونی شعراء کا حال یا ماخذ کا پتہ اس میں بہ آسانی مل جاتا ہے

اعلان بہ حکم پریس رجسٹرار حکومت ہند

فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر کا نام : سید علی اکبر

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد ـ ۵۰۰۰۰۴

نام اور پتہ مالک : ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد ـ ۵۰۰۰۰۴

میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔

سید علی اکبر
(دستخط)

یکم مارچ ۱۹۸۲ء حیدرآباد

عزیز قیسی

دو غزلیں

کرتے ہو زخموں کا بیاں کون سُنے گا
ویرانے میں پھولوں کی زباں کون سُنے گا

تھا ان سے گلہ تم کو وہ سب ہوگئے پتھر
اب کس کو سناتے ہو میاں کون سُنے گا

اب تو یہ لاشوں کے ہے اک جشن کا عالم
اک نامۂ بربادیٔ جاں کون سُنے گا

آفاق ہیں ظلمات میں گم خود کو پکارو
کیا جانے یہ آواز کہاں کون سُنے گا

دل اپنا ہی جب دور ہے خود اپنی زباں سے
قیسی سے غمِ دل زدگاں کون سُنے گا

ہر حسیں شخص کو کب چاہتے ہیں
جس میں ہو کچھ تری چھب چاہتے ہیں

دردِ جاں ہے
وی جینے کا سبب چاہتے ہیں

اک تمہیں ہم سے کھنچے ہو ورنہ
چاہنے والوں کو سب چاہتے ہیں

حیرتِ غم سے یہ خالی شب و روز
سانحہ کوئی عجب چاہتے ہیں

ہم بھی کچھ اپنا تکلف چھوڑیں!
وہ بھی کچھ سوءِ ادب چاہتے ہیں

عفران احمد

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد اس صدی کے آغاز میں ایک تابندہ آفتاب بن کر اُبھرے اور تقریباً نصف صدی تک برِصغیر بلکہ تمام عالمِ اسلام کو اپنے روشن افکار سے فیض پہنچاتے رہے۔ علم و ادب، صحافت، اسلامیات اور سیاسیات، غرض کہ زندگی کا وہ کون سا اہم شعبہ ہے جسے آزاد کی پروقار اور عظیم شخصیت نے متاثر نہ کیا ہو۔ ان کی شخصیت بیک وقت مقامی بھی ہے ملی اور آفاقی بھی۔ وہ ایک دور اندیش سیاستداں، جلیل القدر عالم، بلند پایہ انشا پرداز اور شعلہ نوا صحافی تھے۔ ان کی تحریروں نے قوم کے تنِ مردہ میں جان ڈالی اور اسے حیاتِ نو کا پیغام دیا۔ ان کے انتقال پر اگرچہ پچیس برس بیت گئے لیکن ان کے سیاسی نظریات اور علمی و ادبی افکار آج بھی تازہ ہیں اور موجودہ دور کے لیے ان میں بہت کچھ ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے مولانا کی زندگی میں ان کے بارے میں لکھا تھا۔ "اس عظیم المرتبت ہندوستانی میں نئی پود کے اخذ و جذب کے واسطے بہت کچھ ہے وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالمِ دین اور ہندوستانی اتحاد کے نمائندہ و شارح ہیں اور ان دونوں چیزوں کے اتحاد میں انہوں نے مطلقاً دقت محسوس نہیں کی۔ ان سے کم علم لوگوں کو ہندوستانی زندگیوں کے اتحاد میں ایک باہمی آویزش نظر آتی ہے، لیکن مولانا اس عام سطح سے بہت بلند واقع ہوئے ہیں اور انہوں نے نہ صرف اس تنوع کے پس پردہ حقیقی اتحاد و یکجہتی کو دیکھ لیا ہے بلکہ یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ ہندوستان اور اس کی قومی زندگی کی مختلف سمتوں کی نجات اس یکجہتی و اتحاد سے وابستہ ہے۔"

مولانا غلام رسول مہر نے آزاد کی نادرِ روزگار شخصیت کے بارے میں لکھا ہے۔ "ایسے گوناگوں اوصاف اور محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں انہوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا۔ جن کا حساب مشکل ہے۔ ان میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے، علم و فضل، حقائقِ دین، فلسفہ و حکمت،

شعر وادب، تصنیف وتالیف، تقریر وخطابت، اخبار نویسی وصحافت نگاری، سیاست وملک داری، غرض کہ کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتداء ہی سے سب کے نزدیک ثابت ومسلم نہ تھی۔

مولانا آزاد ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے ان کے والد مولانا خیر الدین جو ایک صوفی، بزرگ اور جید عالم تھے۔ ۱۸۷۰ء میں مکہ معظمہ منتقل ہو گئے تھے، وہاں ان کا مکان باب السلام کے سامنے واقع تھا۔ اس جگہ ۱۸۸۸ء میں مولانا آزاد نے جنم لیا۔ ان کی والدہ عرب تھیں۔ والد کی خشک مذہبیت اور اصول پرستانہ زندگی کے برخلاف ان کی والدہ بڑی مہربان اور حلیم طبع خاتون تھیں۔ مولانا آزاد نے غیر معمولی حافظہ پایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی وفارسی کے رسمی علوم کی تکمیل انہوں نے نو عمری ہی میں کر لی تھی۔ ان کے گھرانے میں عزت وشہرت کی کمی نہ تھی۔ مولانا آزاد چاہتے تو اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پیری مریدی کا طریقہ اختیار کر لیتے۔ یہ راستہ جیسا کہ خود انہوں نے تذکرہ میں لکھا ہے ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ اصل میں قدرت نے ان کو کسی اور مقصد سے اس دنیا میں بھیجا تھا۔

جب مولانا آزاد چار برس کے تھے تو ان کے والد علاج کی غرض سے کلکتہ واپس آ گئے تھے اس کے بعد طویل مدت تک کلکتہ ہی مولانا کی ادبی، سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ ابتدائی زندگی میں مولانا کو شعر وشاعری کا بھی شوق تھا۔ گیارہ برس کی عمر میں انہوں نے داغ اور امیر مینائی جیسے اساتذہ سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور ۱۸۹۹ء میں ایک گلدستۂ شاعری "نیرنگ عالم" نکالا۔ اسی برس کلکتہ سے ایک ادبی ماہنامہ "المصباح" جاری کیا۔ ۱۹۰۲ء میں کلکتہ سے ایک نیا ماہنامہ لسان الصدق نکالا۔ اس کے مقاصد میں سماجی اصلاحات، اردو کی ترقی، علمی ذوق کی اشاعت اور تنقید شامل تھی۔ اس کا شمار فوراً صف اول کے رسائل میں ہونے لگا لیکن اٹھارہ ماہ میں اس نے دم توڑ دیا۔

اس کے بعد مولانا آزاد نے لکھنؤ میں علامہ شبلی نعمانی کے رسالہ "الندوہ" کی ادارت سنبھالی لیکن چھ ماہ بعد اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۰۶ء میں امرتسر کے سہ روزہ اخبار وکیل کی ادارت اپنے ہاتھ میں لی۔ ۱۹۰۸ء میں اس سے الگ ہو گئے۔

مولانا آزاد کی انقلاب آفریں صحافت اور سیاست کا آغاز "الہلال" سے ہوتا ہے۔ ہفت روزہ "الہلال" کا اجرا ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو عمل میں آیا تھا اس وقت ہندوستان میں آزادی کامل کا دور دور تک تصور نہ تھا اور نہ ہی آزادی کے حصول کے لیے کوئی طاقت ور تحریک موجود تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اس کے بعد سے لے کر ۱۹۱۰ء تک جتنی بھی تحریکیں ہندوستان

میں ابھریں وہ اصلاحی اور تعلیمی زیادہ تھیں اور سیاسی کم ۔ ہندستان پر مکمل غلبہ کے بعد ایشیا اور افریقہ کے بیشتر ممالک برطانیہ اور یوروپ کی دوسری بڑی طاقتوں کے زیر اثر آگئے تھے ' ان کا مقابل کوئی نہ تھا ' اس صورت حال میں مولانا ابوالکلام آزاد ' علامہ جمال الدین افغانی اور منشی محمد عبدہ خلافت ترکیہ کو سامراج کے مقابلہ میں ایک بڑا قلعہ تصور کرتے تھے ۔

سامراج کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں یہ قلعہ جب کمزور ہونے لگا تو اس کے خلاف عالم اسلام کو متحد کرنے کی تحریک شروع کی گئی ۔ اس مرحلہ میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کردیا ۔ ادھر خلافت ترکیہ کے مقابلہ میں جنگ بلقان چھیڑ دی گئی ۔ اس سے سارے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اس صورت حال میں ہندوستان میں برطانوی استعمار کے خلاف ایک خوابیدہ قوم کو جگانے کے لیے جس صور اسرافیل کی ضرورت تھی وہ ' الہلال نے فراہم کیا ۔

' الہلال ' نے پہلی بار ہندستانیوں کو احساس دلایا کہ وہ کس خواب غفلت میں پڑے ہیں اور یہ کہ ایشیا میں سامراج کے خلاف انھیں کیا کردار انجام دینا ہے ۔ ' الہلال ' کی شعلہ نوا تحریروں نے دلوں کو گرمادیا اور آزادی کے طویل سفر کے لیے انھیں آمادہ عمل کردیا ۔ ' الہلال ' کا یہی ایک کارنامہ انھیں سیاسی رہنماؤں کی صف اول میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہے ۔ اس کے متعلق شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی جیسے عالم دین نے کہا ہے : " ہم اپنا سبق بھولے ہوئے تھے ۔ جو ہمیں ' الہلال ' نے یاد دلایا ۔"
الہلال کا پہلا دور ۱۸ ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ختم ہوا ۔

۱۲ ر نومبر ۱۹۱۵ء کو ' البلاغ ' نکالا گیا یہ اخبار ۳۱ ر مارچ ۱۹۱۹ء تک جاری رہا ۔ ۲۰ ر جون ۱۹۲۷ء کو پھر ' الہلال ' کا اجرا عمل میں آیا اور اسی برس ۹ ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہمیشہ کیلئے بند کردیا گیا ۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی خدمات ناقابل فراموش ہیں ۔ انہوں نے تحریر و تقریر اور اپنی سرگرمیوں سے آزادی کی تحریک میں جان ڈال دی ۔ اور اس کے لیے متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ۔ ان کا شمار ہمیشہ انڈین نیشنل کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں میں رہا ۔ ۱۹۲۳ء میں انہوں نے دلی میں کانگریس کے خاص اجلاس کی صدارت کی ۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور ۶ ر جولائی ۱۹۴۶ء تک صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے ۔ سیاسی لحاظ سے یہ ملک کا نازک ترین دور تھا ۔ برطانیہ سے کرپس مشن اور بعد ازاں کابینہ مشن اس دوران میں آئے اور اپنے ساتھ سیاسی تجاویز لائے ۔ ان پر معرکتہ الآرا بحثیں ہوئیں ۔ انڈین نیشنل کانگریس کا ۵۳ واں اجلاس مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڈھ (بہار) میں منعقد ہوا ۔ مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کے لیے

دستور ساز اسمبلی اور مکمل آزادی کا مطالبہ کیا۔ مسلمانوں کو مستقبل کے بارے میں آزادانہ غور کرنے کی دعوت دی اور اس پر زور دیا کہ ہندوستان کا دستور اساسی، وفاقی اور جمہوری ہوگا۔ جس کے تمام حلقے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے۔ اسی اجلاس میں کانگریس نے جنگ میں برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو زبردستی جھونکنے کے خلاف تاریخی قرارداد منظور کی۔ ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کو "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک مولانا کے دور صدارت کا اہم واقعہ ہے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں تمام قومی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا آزاد پنڈت نہرو کے ساتھ احمد نگر جیل میں رکھے گئے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے فروری ۱۹۵۸ء یعنی اپنی وفات تک وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تعلیم رہے۔ کابینہ کے تمام اہم سیاسی فیصلوں میں ان کا مشورہ شامل رہا۔ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے کئی تاریخی اصلاحات کیں۔ تعلیم کے معاملے میں وہ مغرب کی اندھا دھند تقلید کے مخالف تھے اور مشرق و مغرب کے تعلیمی نظریات میں ہم آہنگی لانا چاہتے تھے۔ ان کے دور میں متعدد تعلیمی بورڈ یا کمیشن تشکیل دیئے گئے۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹیکنالوجی (کھڑگ پور) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ فنون لطیفہ کی ترقی کے لئے ساہتیہ اکاڈمی، سنگیت ناٹک اکاڈمی اور للت کلا اکاڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مولانا آزاد نے ہریجنوں، قبائلی اور پسماندہ طبقوں کے لیے تعلیمی وظائف کی اسکیم جاری کی۔

الہلال اردو صحافت کی آبرو ہے۔ الہلال نے اردو صحافت کو زبان دی۔ دراصل اردو میں جدید صحافت کا آغاز الہلال ہی سے ہوتا ہے اس سے پہلے بھی رسائل اور اخبارات کی کمی نہ تھی۔ لیکن ان کا دائرہ محدود تھا۔ الہلال اگرچہ ہفت روزہ تھا لیکن اسے مکمل اخبار بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ادب، مذہب، سائنس، عمرانیات اور سیاست پر اس کے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹر کا ہاتھ زمانہ کی نبض پر ہے۔ بے شمار نئی اخباری اصطلاحات اور علمی الفاظ "الہلال" کی دین ہیں اور یہی ایک اخبار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ الہلال کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مدیر کی عصری مسائل پر گرفت ہے۔ ان تحریروں کا امتیاز جوش خطابت ہے۔ یہ تند و تیز اور طوفانی لہجہ "الہلال" کے مشن کے لیے ضروری تھا۔ تاہم الہلال کے پہلے دور اور دوسرے دور کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے اسلوب نے ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ اس میں روز بروز نکھار، فکر انگیزی اور خیال آفرینی آتی گئی۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں علامہ جمال الدین افغانی نے پیرس سے رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" نکالا تھا۔ اس نے مشرق کو استعمار کے خلاف جھنجھوڑنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مولانا آزاد کی تحریروں پر اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔" خود مولانا آزاد الہلال کے بارے

ہیں "ہماری آزادی" میں لکھتے ہیں۔ "الہلال کی اشاعت سے اُردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس اخبار کو قلیل مدت کے اندر بے نظیر ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ پبلک کے لیے باعث کشش صرف اس کی اعلیٰ طباعت نہیں تھی بلکہ اس سے زیادہ قومیت کا وہ جذبہ تھا جس کی وہ دعوت دیتا تھا۔ الہلال نے عوام میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی۔"

کچھ نقادوں کو شکایت ہے کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ ملتے ہیں۔ جن الفاظ کو ثقیل کہا گیا ہے وہ مولانا کے مزاج میں شامل تھے اور اس دور کے پڑھے لکھے طبقے کی روزمرّہ کی زبان میں شامل تھے۔ یہ الفاظ صوتی وفنائی لحاظ سے عبارت کا حسن بڑھاتے ہیں اور اس سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان کے ہاں طلسم سرائے ہستی، نشۂ نیم شبی، الائے شب، جلوہ یوسفی، شمیم پیراہن جیسی دلکش تراکیب ملتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

"خدا جانے کتنے نئے اور جاری بھرکم لغات نئی ترکیبیں، نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان ہر ہر ہفتہ ان کی ادبی اور علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکّہ رائج الوقت بن گئے۔"

مولانا آزاد نے اپنے سیاسی سفر کا آغاز ہی ہندو مسلم اتحاد سے کیا تھا۔ ان کی سیاسی فراست نے اس صدی کے آغاز ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ برطانوی سامراج سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد اور خود ملک کی فلاح و بہبود تمام تر ہندو مسلم اتحاد پر منحصر ہے۔

تحریک خلافت کے نتیجہ میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے اور زیادہ نزدیک آ گئے تھے۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندو مسلم اتحاد کا زریں دور تھا۔ وہ بار بار مسلمانوں کو جھنجھوڑتے تھے اور آزادی کی مشترکہ جنگ میں شرکت کی دعوت دیتے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد بھی جب کہ فرقہ وارانہ سیاست نے ملک کی فضا کو مکدر کر دیا تھا اور مسلم لیگ کی طرف سے تقسیم ملک اور جداگانہ انتخابات جیسے مطالبات کیے جا رہے تھے، مولانا آزاد اپنے خیالات پر سختی سے قائم رہے اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی طرف بلاتے رہے۔ ایک موقع پر فرمایا۔

"اگر بادلوں سے اتر کر ایک فرشتہ قطب مینار کی چوٹی پر کھڑا ہو جائے اور یہ اعلان کرے کہ ہندوستان کو آزادی آج ہی مل سکتی ہے بشرطیکہ وہ ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی سے دست بردار ہو جاؤں گا لیکن ہندو مسلم اتحاد کو نہیں چھوڑوں گا۔ کیونکہ اگر ہمیں آزادی

نہ ملی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہندو مسلم اتحاد نہ رہ سکا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔
الہلال (دور جدید) میں ایک طویل مضمون میں مولانا آزاد نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام اور نیشنلزم کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے وہ ہندوستانی مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان کے لئے ملک کی خدمت اور اس کی فلاح و بہبود کی فکر اسلام کا حکم ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے رام گڑھ اجلاس ۱۹۴۰ء کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے وضاحت سے بتایا کہ وطنیت اور اسلامیت کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے۔
انہوں نے اعلان کیا "ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی تعمیر سامانیوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں ہماری شاعری' ہمارا ادب' ہماری معاشرت ہمارا ذوق' ہمارا لباس' ہمارے رسم و رواج اور ہماری آزاد زندگی کی بے شمار حقیقتیں' کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔
یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔
مولانا اسلامی علوم کے ایک جید فاضل تھے۔ "الہلال" کے بعض گراں قدر مضامین سے اسلامیات پر ان کے عبور کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم اسلامیات میں ان کا امتیازی کارنامہ تفسیر ترجمان القرآن ہے جو ان کی مصروف ترین زندگی کے باعث نامکمل رہی۔ اس تفسیر سے اسلامی علوم میں مولانا کے علمی مقام کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ سورۂ فاتحہ میں خدا کے تصور پر ان کی معرکۃ الآرا بحث الٰہیات ہر طالب علم کی توجہ اپنی جانب کھینچے گی۔ تفسیر میں وہ ایک طرف اسلاف کی تمام تشریحات کو سامنے رکھتے ہیں اور دوسری طرف دور جدید کا لحاظ کرتے ہوئے معانی و مطالب کی وضاحت کرتے ہیں یہ ایک ایسا نازک کام ہے جس سے بہت ہی کم لوگ راہ نکال لے گئے ہیں۔ مولانا آزاد کے قلم سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ تفسیر میں جو اسلوب مولانا نے اپنایا ہے وہ عام فہم اور اثر انگیز ہے۔
سرکردہ مصنف مالک رام نے ترجمان القرآن کے اسلوب کے متعلق لکھا ہے۔
"جو لطف زبان و بیان اور صحت و برجستگی ترجمان القرآن میں ملی وہ کسی پیشرو یا پیرو کے ہاں دیکھنے میں نہ آئی"
یوں بھی مولانا آزاد میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ موضوع کے مطابق اسلوب بیان اختیار کرتے تھے۔ ادبی موضوع ہو تو ان کا قلم ادبی گل افشانیوں کے لیے وقف ہوتا تھا۔ مذہبی یا علمی موضوع ہو تو ان کا اسلوب یکسر متین' سنجیدہ اور گہرا ہو جاتا' برصغیر کے کسی اور قلمکار میں یہ

خوبی نہیں ملتی۔

مولانا آزاد نے ادبی موضوع پر کوئی تصنیف نہیں چھوڑی لیکن قلعہ احمد نگر میں لکھے گئے خطوط ' جو "غبارِ خاطر" کے نام سے شائع ہوئے ' خود نوشت سوانح حیات تذکرہ اور الہلال کے بعض مضامین ہمارے ادب کا ایک وقیع سرمایہ ہیں اور اردو کی ادبیاتِ عالیہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

"غبارِ خاطر" میں مولانا کی جامع صفات شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہے اگر یہ خطوط نہ لکھے جاتے تو اس تہہ در تہہ شخصیت کی ذہنی زندگی کے کئی پہلو ہمیشہ کے لیے ہماری نگاہ سے اوجھل رہ جاتے۔ مولانا کے خطوط کے دوسرے مجموعے بھی شائع ہو گئے ہیں لیکن جو انداز "غبارِ خاطر" کا ہے وہ کسی اور میں نظر نہیں آتا۔ مولانا غلام رسول مہر "غبارِ خاطر" کے اسلوب پر یوں خیال آرائی کرتے ہیں۔

"غبارِ خاطر" پڑھ کر وادیٔ کشمیر کی ایک نرم رو جوئبار کا احساس ہوتا ہے جس کے دونوں طرف سفید رنگ کے سیدھے سیدھے اور خوشنما درخت ہیں۔"

قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں: "جس طرح غالب نے اپنی نظم میں، اُسی طرح مولانا نے اپنی نثر میں کسی دوسرے کے اسلوب نگارش کی تقلید کو گناہ سمجھا ہے یہ کوئی مصنوعی انداز نہیں ہے بلکہ ایک قدرتی انفرادیت ہے اس میں نہ تو کوئی دوسرا ادیب مولانا کا شریک ہو سکتا ہے اور نہ ان کی انفرادیت اور نہ ان کے آرٹ کو اپنا سکتا ہے۔"

"غبارِ خاطر" میں مولانا کے اسلوب نگارش کا اندازہ اس اقتباس سے ہو سکتا ہے۔

"انسان کا اصل عیش دماغ کا عیش ہے' جسم کا نہیں ہے۔ میں لذتیہ (فلسفہ کا ایک مکتب فکر) سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں۔ جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے ہیں اگر یہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے گا کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے۔ خود ہمارے اندر ہے۔"

"تذکرہ" میں جو مولانا کی خود نوشت سوانح حیات ہے بلا کی روانی اور دلکشی ہے۔ اس کی تصدیق ذیل کے اقتباس سے ہو سکتی ہے:

"جس حال میں رہے نقص اور ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید اور روشِ عام سے پرہیز جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی کسی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم رہنما چھوڑا۔"

صاحب حیدرآبادی

دو غزلیں

ہر فسانے کا ہوں عنواں جب جہاں لکھنا مجھے
جلنے والی ہر عمارت کا دھواں لکھنا مجھے

کب وفورِ گل کے باعث تھی نشیمن کی جگہ
ذکر ہی مقصود ہو تو بے نشاں لکھنا مجھے

مُہر بر لب شیشۂ مے کی طرح ہوں ساقیا
جب بھی لکھنا میکدے کا رازداں لکھنا مجھے

مثلِ اشکِ رائیگاں اشک رواں بہتے رہے
وقت کے ماتھے پہ عمرِ رائیگاں لکھنا مجھے

میری قسمت کا لکھا جیسے کہ پتھر کی لکیر
شوخیٔ تحریر کا رنگِ رواں لکھنا مجھے

آئینہ در آئینہ در آئینہ ہوں فطرتاً
داستاں در داستاں در داستاں لکھنا مجھے

ہوں ہلاکِ خنجرِ بیدادِ ہر دجالِ دہر
پیشِ دستِ مہدیٔ آخر زماں لکھنا مجھے

ہر زمانے نے برابر قتل کے ساماں کئے
راہِ حق میں جادۂ پیغمبراں لکھنا مجھے

کتنے ہی قرطاسِ ابیض سرخ صاحبؔ ہوگئے
کربِ طوفاں کا بحرِ بیکراں لکھنا مجھے

تو نے بھولے سے کبھی پھینک دیا تھا پتھر
وہ بنا اپنی محبت کی بنا کا پتھر

کس لیے مجھ کو لگاتا ہے زمانہ ٹھوکر !
کب کسی کے لیے میں راہ کا ٹھہرا پتھر

آپ کی یاد نے جب ہم کو بہت تڑپایا
ہم نے سینے پہ رکھا اور بڑا سا پتھر

محترم جس کو خدا چاہے کرے اس کی خوشی
بوسہ گاہِ بشرِ پاکاں ہے حرم کا پتھر

اپنی محرومیٔ قسمت کا گلہ کیا کیجیے
موم ہے دستِ ہنرمند میں کیسا پتھر

محوِ حیرت ہے تری سنگدلی پر صاحبؔ
پھول سے جسم میں پیدا ہوا کیسا پتھر

عابد صدیقی

سکندر علی وجد

ارضِ دکن کے جن شعراء نے دنیائے ادب کو اپنے شعری اور فکری سرمایہ سے مالا مال کیا ہے ان میں حضرت سکندر علی وجد نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

سکندر علی وجد کا شمار اردو شاعری کے باکمال اور منفرد انداز کے شاعروں میں ہوتا ہے وہ گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر روایات کے علمبردار اور عظیم محب وطن تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ بھی اس ملک کے وقار کو بلند کیا ہے اور یہاں کے تہذیبی آثار ان کی شاعری کے پیکر میں ڈھل کر زیادہ خوبصورت اور لافانی بن گئے چنانچہ وجد کی شاعری میں اجنتا کا حسن، ایلورہ کا جمال، عثمانیہ یونیورسٹی کا وقار اور ہندستان کی عظیم تہذیب و تمدن کی سبک اور خوبصورت علامات ملتی ہیں۔

سکندر علی وجد کی موت سے اہلِ دکن ہی کو نہیں بلکہ اردو زبان و ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ وجد نے اپنی شخصیت اور شاعری کے ذریعہ ہمارے ادب، تہذیب اور رویوں کو متاثر کیا ہے۔

سکندر علی وجد ۲۲ فروری ۱۹۱۴ء کو بیجاپور میں پیدا ہوئے اورنگ آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم پائی اور جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے حیدرآباد سیول سرویس کے مسابقتی امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مولانا وحیدالدین سلیم جیسے اساتذہ کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وجد جج کے عہدہ پر فائز ہوئے اور جب ریاستوں کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ آیا تو ان کی خدمات ریاست مہاراشٹر کے تفویض کی گئیں وہاں وہ سشن جج کے عہدہ پر فائز تھے۔ اپنی ملازمت کے ۲۷ سال کے دوران، وہ قانون کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے ساتھ ساتھ شاعری کیلئے اپنا لہو جلاتے رہے۔

۱۹۳۰ء سے ہی انہوں نے شاعری کا آغاز کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کا پہلا مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں سکندر علی وجد مہاراشٹرا انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیے گیے۔ اردو زبان وادب کی سنجیدہ اور پرخلوص خدمت اور ان کی شاعری نے انھیں ہند وپاک کے ممتاز شعــرا کی صف میں لا کھڑا کردیا۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے "پدم شری" کا اعزاز انھیں پیش کیا۔ ۱۹۷۲ء میں سکندر علی وجد ہندستان کے ایوانِ بالا (راجیہ سبھا) کے رکن نامزد کیے گیے۔ ۱۹۷۵ء میں وہ مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کے نائب صدر اور ۱۹۷۷ء میں انھیں غالب ایوارڈ پیش کیا گیا تھا۔ اس دوران ان کے دو مجموعہ کلام "اوراقِ مصوّر" اور "بیاضِ مریم" شائع ہوے۔ جواہر لال نہرو نے اوراقِ مصوّر اور وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے "بیاضِ مریم" کی رسم اجرا انجام دی۔ ۱۹۸۱ء میں سکندر علی وجد ترقی اردو بورڈ کے صدر بنائے گیے۔ وجد کی شخصیت اور شاعری بڑی دلآویز تھی' گویا ان کی شخصیت' ان کی شاعری کا آئینہ اور شاعری شخصیت کا پرتو تھی۔

وجد کی شاعری میں روحِ عصر کی ترجمانی ملتی ہے۔ انہوں نے غزل کی کلاسیکی شعری روایات کو نیا حسن اور فطری بانکپن دیا اور نظم کو جمالیاتی احساس اور فکر و نظر کی وسعتوں سے مالا مال کیا۔ ان کی شاعری غم دوراں اور غم جاناں کی تعبیر ہے۔ وجد نے اردو شاعری میں مناظرِ قدرت اور مظاہر فطرت سے اپنی نظموں کو ایک خوبصورت کلاسیکی انداز دیا ہے۔ تحریک آزادی اور ملک کے سیاسی نشیب وفراز اور ہمارے بدلتے ہوے سماجی مسائل وجد کی شاعری میں بڑی خوبصورتی سے جذب ہو گیے ہیں۔

مزدوروں کا پیغام' تاج محل' مہاتما گاندھی' پیغامِ اقبال جیسی نظمیں ان کے ذہنی سفر اور فنی ارتقا کی بلندیوں کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ خاص طور پر وجد کی شاہکار نظم "اجنتا" ہے جو بلاشبہ اردو کی بلند پایہ نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس نظم میں وجد نے اجنتا کے نقوش کو لفظوں کا پیرہن دے دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظم "رقاصہ" بھی ان کے احساسِ جمال اور فنی عظمتوں کی دلیل ہے۔

سکندر علی وجد نے محمد قلی قطب شاہ' ولی دکنی' سراج' امجد' مخدوم کے بعد اردو شاعری کو حرکت وانقلاب سے آشنا کیا۔ ان کی شاعری ہمارے شعر وادب کا انمول سرمایہ ہے۔ وہ نظموں کے ساتھ ساتھ غزل کے بھی شاعر ہیں اور اپنی غزلوں میں بھی زندگی کا حسن بانٹتے نظر آتے ہیں۔ وجد کی شاعری میں ہمارے بدلتے عہد کے تصورات اور شعری رویوں کی تصویر ملتی ہے۔ چنانچہ ان کی شاہکار نظم 'اجنتا' میں خیال اور معنی آفرینی بلندیوں کو چھوتے ہیں۔ لفظوں کی تراش خراش' لہجہ کی خوبصورتی اور طرزِ اظہار کی نیرنگی' اجنتا کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں ؎

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کردیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کردیں
یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں
زمانے کی جبیں پہ عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
بچے گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد نے اپنی شاعری کو زندگی کی صداقتوں سے قریب تر کیا تھا۔ انہوں نے شاعری کو ترقی پسند، رجعت پسند اور جدیدیت کے خانوں میں تقسیم کرنے سے احتراز کیا تھا بلکہ ان کے خیال میں شاعری جو فکر کو جھنجھوڑ دے اور دل میں ایک شاداب امنگ پیدا کردے، وہی اچھی شاعری ہے اور ایسی شاعری جو زندگی کے سوز و ساز سے محروم ہے شاعری نہیں لفاظی ہے۔ انہوں نے شاعری کو زندگی کا آئینہ قرار دیا تھا۔ سکندر علی وجد کے افکار پر مخدوم محی الدین کا گہرا اثر موجود تھا۔ چنانچہ ان کی بعض نظموں پر تحقیق کی جائے تو ہمیں مخدوم کے شعری لب و لہجہ کا پرتو صاف طور پر ملتا ہے۔

سکندر علی وجد نے اپنے شاعری کے اظہار کے لیے ایک منفرد انداز اختیار کیا تھا۔ ورنہ اس دور کی شاعری میں یکساں طرز اظہار کی روایت چل پڑی تھی۔ اس ہجوم میں وجد کی اپنی ایک منفرد اور چونکا دینے والی آواز نے ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ان کی شاعری احساس زمانہ سے عبارت ہے۔

وجد کی زبان بڑی شگفتہ ہے اور الفاظ کی خوبصورتی دل کی گہرائیوں تک پہونچ کر فکر و احساس کو مسرت و بصیرت فراہم کرتی ہے۔ وجد کی شاعری زندگی کی سچائیوں اور صداقتوں کی تعبیر ہے اس میں ہمیں وہم و خیال نہیں بلکہ حقیقت اور سچائی پوری آب و تاب کے ساتھ ملتی ہے وجد کا قوت مشاہدہ بڑا گہرا اور تیز تھا۔ ان کا ذہن انسانی شعور کا پورا پس منظر سموئے ہوا تھا اس لیے ان کی شاعری میں زندگی کی کشاکش کے ساتھ ساتھ تسخیر کائنات کے لیے زمین سے اٹھتا ہوا انسانی ہاتھ، فلک کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک جگہ اپنی شاعری کے بارے میں لکھا ہے کہ

پیغمبر برحق ہوں جمالِ ازلی کا! ہر شعر میں ایک معجزہ خوشِ نظری کا

سکندر علی وجد کی شاعری میں وضع داری اور تہذیب کا بانکپن ملتا ہے یہی بانکپن وجد کی

شاعری کے مزاج اور لہجہ کی اساس ہیں مگر ان کی شاعری کو عظمت اور رفعت عطا کرتا ہے۔ وہ احتجاج بھی نہیں کرتے اور نہ ہی انہوں نے پروپگنڈہ کا طریقہ اپنایا ہے بلکہ ان کا جذبۂ تشکیک اور تذبذب انھیں کئی جہانوں کی تلاش پر اکساتا ہے۔

وجد مادرِ جامعہ کے سپوت تھے اور انہوں نے اسی جامعہ سے شعور و فکر کی روشنی حاصل کی۔ ان کے ساتھیوں میں مخدوم، اشفاق حسین، شہاب، راج بہادر گوڑ اور دوسرے کئی عثمانین شامل تھے۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بے پناہ محبت کی اور اس کے پرستاروں میں شامل رہے۔ چنانچہ اپنی نظم "مزدوروں کے پیغام" میں آرٹس کالج کی خوبصورت عمارت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اسے فن کاری کا ایک عظیم نمونہ قرار دیا۔

مزدوروں کی فن کاری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

ہم نے نقشِ ہوسِ خام نہیں چھوڑا ہے　　کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

سکندر علی وجد اردو کے ایک عظیم المرتبت شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں زندگی کی نفاستیں اور لطافتیں سمٹ آئی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ اپنی شاعری پر ناز بھی کیا ہے کہ

دو سو برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد　　اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ وطن سے ہم

بلاشبہ وجد ارضِ دکن سے جھوم کے اٹھے تھے اور انھیں اس سرزمین پر بھی ناز تھا اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک قطعہ میں کیا تھا ؎

فضا جاں فزا، ذرہ ذرہ حسین ہے　　حقیقت میں ملکِ دکن گل زمیں ہے
اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے　　تو بے شک یہیں ہے، یہیں ہے، یہیں ہے

سرزمینِ دکن کا یہ قادر الکلام شاعر ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے لاکھوں پرستاروں کو داغِ مفارقت دے گیا لیکن اس کی شخصیت کے اَن مٹ نقوش ہمیشہ ہمیشہ ہمارے ذہن و دل پر مرتسم رہیں گے۔ جب تک انسانیت، دوستی، شرافت، اخلاص اور وضعداری کی اعلیٰ قدریں ہمارے سماج میں باقی ہیں، وجد کا نام تابندہ رہے گا۔ اور ان کی یادیں تڑپاتی رہیں گی۔ جب تک اردو زبان رہے گی، وجد کی شاعری زندہ رہے گی جب تک اجنتا کے نقوش کی دلنوازی اور دلربائی باقی رہے گی۔ "اجنتا" کے شاعر کے فکر و فن کی شمع جلتی رہے گی۔ "آفتابِ تازہ"، "لہو ترنگ"، "بیاضِ مریم" اور "اوراقِ مصور" ہمارے ادب اور شاعری کے وہ صحیفے ہیں جو شعراء کی آنے والی نسلوں کے لیے چراغِ راہ کا کام کریں گے۔

وقار خلیل

اُردو نامہ

اُردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم فروری: نئے لہجے کے جواں فکر اُردو شاعر جناب محمد مجیب اللہ صدیقی لکچرار ہندی، جو بزمِ اُردو ادب عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر رہ چکے ہیں ان دنوں جی یم سگھی کالج حیدرآباد کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے ہیں۔

● کُل ہند اُردو کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بمبئی نے ایک قرارداد کے ذریعہ وزارتِ تعلیم حکومت ہند سے اس امر کا مطالبہ کیا ہے کہ ترقی اُردو بیورو کی ایک شاخ برائے جنوبی ہند کا حیدرآباد میں قیام عمل میں لایا جائے۔ مسٹر جلیل پاشاہ صدر کانفرنس نے اجلاس کی صدارت کی۔

۶ فروری: ممتاز ترقی پسند صحافی اور ادیب جناب احسن علی مرزا سب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کا بعارضہ قلب اچانک انتقال ہوا جلوسِ جنازہ میں ادیبوں دانشوروں اور صحافیوں نے شرکت کی، اور مرزا صاحب کی وفات پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا۔

۷ فروری: ممتاز دانشور پروفیسر سید سالم خوندمیری مرحوم کے مجموعۂ مقالات "پیامِ عشق" کی رسمِ اجرا انجمن مہدویہ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک علمی اجلاس میں مولانا سید محمد الکیلوی نے انجام دی۔ پروفیسر مغنی تبسم، مولوی خدا بخش خوندمیری اور جناب ظہیر الدین احمد صدر اقبال اکیڈیمی نے پروفیسر عالم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر عالم کی فکر اور یاد میں میموریل کمیٹی اور ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا جانے والا ہے۔

۱۰ فروری: روزنامہ سیاست کے انتظامیہ اور اسٹاف کی طرف سے جلسۂ تعزیت مرحوم احسن علی مرزا کے موقع پر ان کے صاحبزادوں کو گریجویٹی اور ایک ماہ کی تنخواہ پیش کی گئی اور فیملی ویلفیر ٹرسٹ کے بارے میں فیصلہ کیا گیا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور جناب ذہانت علی بیگ صاحبان نے مرزا مرحوم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۱۱ فروری: ریاستی انجمن ترقی اُردو اور ترقی پسند مصنفین کی طرف سے اردو ہال میں منعقدہ جلسۂ تعزیت میں احسن علی مرزا کو مقررین نے خراج ادا کیا۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان نے صدارت کی۔ جناب سید رحمت علی (ایم پی)، ڈاکٹر حسینی شاہد، جناب محمود انصاری ایڈیٹر منصف نے مخاطب کیا۔

● ریاستی اُردو اکیڈیمی نے احسن علی مرزا کی وفات پر اظہارِ الم کرتے ہوئے پسماندوں کو ۳ ہزار روپے کی امداد پیش کی۔

● ریاستی اُردو اکیڈیمی نے ۱۹۸۴ء کا مخدوم ادبی ایوارڈ برائے صحافت جناب سید وقار الدین ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن کو دینے کا اعلان کیا۔

● ادارۂ معراج ادب اور بزمِ شاب کی طرف سے مشفق سکول کے شاعر حکیم مرزا سرفراز علی ناوک

مرحوم کے شعری مجموعہ "قرینۂ غزل" کی رسم اجرا کے سلسلے میں ادبی اجلاس اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو اوپن یونیورسٹی حیدرآباد نے رسم اجرا انجام دی۔ جناب صادق نقوی اور مبشر احمد نے ناوک کی شاعری پر مقالے سنائے۔ جناب محمد منظور احمد نے مشاعرہ کی صدارت کی۔ قدیم اور جدید دبستان سخن کے شاعروں نے کلام سنایا۔ جناب خورشید جنید نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۲ر فروری: ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ۲۲ ویں سالانہ یوم محمد قلی قطب شاہ دو روزہ تقاریب کا افتتاح مرکزی وزیر توانائی و پٹرولیم مسٹر پی شیوشنکر نے گنبد محمد قلی کے وسیع و عریض چبوترہ پر اپنی تقریر سے کیا۔ ابتدا "فائن آرٹس اکیڈیمی" کے فنکاروں امیر محمد خاں، اطہر اور ستیش نے محمد قلی کی مناجات سنائی۔ پھر کرشنا انکم نے "تلنگو قلی" ترانہ سنایا۔ جناب رحمن راج سکینہ معتمد عمومی ادارہ نے استقبالیہ تقریر کی۔ اور جناب حامد علی عباسی صدر ادارہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ مسرور نرسمہا راؤ ڈپٹی کمشنر میونسپل کارپوریشن جناب صلاح الدین نیر، محترمہ عزیز النسا ضیا نے بانیٔ شہر کو خراج ادا کیا۔ جسٹس محمد رفیع الدین انصاری چیرمین ریاستی اقلیتی کمیشن نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ معزز مقررین نے محمد قلی کے عہد، اس کی شاعری اور حیدرآباد کے روایتی گنگا جمنی کلچر کے تناظر میں اس مقبول عوام تقریب کو قومی یکجہتی کا موثر ذریعہ قرار دیا اور ادارۂ ادبیات اردو کی علمی ادبی اور ہمہ مقصدی سرگرمیوں کو خراج ادا کیا۔ ممتاز حیدرآبادی شعراء کا کلام سازوں پر سنا گیا۔ عزیز احمد خاں وارثی اور ان کے ساتھیوں نے قوالی کا پروگرام پیش کیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم شریک معتمد ادارہ نے شکریہ ادا کیا۔

● یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر گنبد محمد قلی پر سالانہ اجتماعی ظہرانہ اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب علی احمد جلیلی نے صدارت کی۔ ابتدا جناب رحمن راج سکینہ اور جناب سریندر اس لاہوتی شریک معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے خطاب کیا۔ مشاعرہ میں جس کے کنوینر جناب بشیر وارثی تھے، مسز عابدہ قادری منیر الزماں منیر، مسعود عابد، اکبر یوسفی حبیب علی حبیب، راحت عزمی، راجہ لال راجہ، منوہر لال بہار، صادق نقوی، عباس متقی، اقبال حسین اقبال اسد انصاری، محمد منظور احمد، قاسم موسوی، شہاب ثاقب، داؤد نصیب ستار چشتی، بو علی شریف، حضرت سعید شہیدی، قمر رضا، اعظم شفیقی اور معتمد مشاعرہ وقار خلیل نے کلام سنایا۔

۱۳ر فروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کا ادبی اجلاس ۶ بجے شام ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ پروفیسر غلام عمر خاں صدر شعبۂ اردو اوپن یونیورسٹی حیدرآباد نے صدارت کی اور کہا کہ یوم محمد قلی تقاریب علمی ادبی اور لسانی اہمیت رکھتی ہیں جنوبی ہند کے ان حکمرانوں نے تصادم کی صورت حال سے گریز کی پالیسی کو اپنا کر انسانی اقدار کو فروغ دیا اس تناظر میں ان کی یاد کو تازہ کرنا اور ماضی کی روایات کو حال پر منکشف کرنا ثقافتی فریضہ کی ادائیگی کے مترادف ہے پروفیسر عمر خاں نے ڈاکٹر زور کی دکنیات

شناسی کو خراج ادا کرتے ہوئے کلیات محمد قلی کی ترتیب و تدوین کو اہم کارنامہ قرار دیا۔ ادبی اجلاس میں قطب شاہی تمدن و ثقافت پر ڈاکٹر دھرمیندر پرشاد نے جامع اور بسیط مقالہ سنایا۔ پروفیسر گوپال کرشنا صدر شعبۂ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی نے قطب شاہی دور کے جاگیردار امین خان کی مذہبی و ثقافتی روادارانہ خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے محمد قلی کی شاعری کے سماجی پہلو پر اظہار خیال کیا۔ جناب محمد منظور احمد نے محمد قلی معانی کی شاعری اور قطب شاہی کلچر پر سیر حاصل مقالہ سنایا۔ جناب راحت عزمی نے عہد قطب شاہیہ کے آخری پیشوا علامہ ابن خاتون کی شخصیت اور علمی و مذہبی کارناموں پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر سید رحمت علی نے قطب شاہی عہد کے فارسی ادب پر مقالہ پڑھا۔ جناب صادق نقوی لکچرر تاریخ جامعہ عثمانیہ نے نظامت کی۔ اس جلسہ میں ابتداً جناب لطیف الدین قادری مینیجنگ ایڈیٹر رہنمائے دکن اور ممتاز ترقی پسند ادیب و صحافی جناب احسن علی مرزا کی وفات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

● یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا اختتام ایوان اردو میں ۹½ بجے شب منعقدہ یادگار مشاعرہ پر ہوا جس کی صدارت جناب یم یل نگم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے کی اور جناب رئیس اختر نے نظامت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ وقار خلیل نے محمد قلی پر اپنا سانیٹ سنا کر شعری محفل کو روشن کیا پھر علی الترتیب رئیس اختر، میر الزماں منیر، راجہ لال راجہ قاسم موسوی، راحت عزمی، صلاح الدین نیر، انور ہاشمی، رشید شہیدی، جوہر ہاشمی، علی الدین نوید، مرزا استیو علم اکبر یوسفی، کنول پرشاد کنول، بشیر وارثی، منوہر لال بہار، بانو طاہرہ سعید ڈاکٹر اشرف رفیع، راز عابدی محمد منظور احمد منظور، فیض الحسن خیال الہام واحدی، صادق نقوی، رحمن جامی عزیز النساء صبا، راشد آذر، سعید شہیدی، علی احمد جلیلی اور ڈاکٹر نگم نے اپنی شاعری سے شائقین کو متاثر کیا۔

۱۳ر فروری: قدیم شعری ماسکل کے شاعر جناب سراج حیدرآبادی کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوا۔ مرحوم برسوں ادارہ کی شعری محفلوں میں شرکت کرتے رہے۔ خدا مغفرت کرے۔

۱۸ر فروری: گولکنڈہ سوسائٹی کی طرف سے گنبدان قطب شاہی گولکنڈہ پر ایک شعری محفل جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر سید اختر درانی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے علاوہ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر یم یل نگم، امیر احمد خسرو، رئیس اختر اور صلاح الدین نیر نے کلام سنایا

۱۹ر فروری: نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری کے اسٹڈی سرکل حلقۂ ادبیہ ذوق کے ادبی اجلاس میں برمنگھم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر سید اختر درانی نے "اقبال اور یورپ" کے موضوع پر لکچر دیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جناب محمد منظور احمد نائب نے شکریہ ادا کیا۔

● اقبال اکیڈمی کی طرف سے پروفیسر درانی کو استقبالیہ دیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر سید اختر

اقبال پر قیام جرمنی کے اثرات پر عالمانہ اظہار خیال کیا۔

۲۰ ر فروری: بزم اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے ممتاز ادیب اور محقق جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر جاوید حسین رضوی نے گپتا رضا کی علمی وتحقیقی صلاحیتوں اور اردو شعر و ادب سے ان کی والہانہ رفاقت پر اظہار خوشنودی کیا اور کتب خانہ رضا کو ادبیات کا اہم مرکز قرار دیا جناب حبیب شاکر صدر بزم نے تقریب کی صدارت کی۔

۲۳ ر فروری: ڈاکٹر افضل اقبال لکچرار سکندرآباد کالج کی نئی تحقیقی کتاب "اردو کا پہلا نثری ڈرامہ" شائع ہوئی۔

۲۴ ر فروری: عثمانیہ یونیورسٹی کے خبرنامہ کے مطابق ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر یوسف سرمست کو پروفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی ہے اور ڈاکٹر میرزا اکبر علی بیگ کو ریڈر شعبۂ اردو مقرر کیا گیا ہے ادارہ ان اصحاب کو مبارکباد پیش کرتا ہے

۲۵ ر فروری: عثمانیہ یونیورسٹی نے نامور سخنور جناب سید مصلح الدین شاذ تمکنت کو "مخدوم حیات اور کارنامے" پر اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر شاذ نے یہ مقالہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔

● اردو سبھا کا ادبی و شعری اجلاس جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے حضرت شمس الدین محمد فیض کی شاعری پر مقالہ سنایا۔ مسرز یعقوب عمر، داؤد نصیب، جیلانی بیگ صادق، راجہ لال راجہ، وحید الحسن ہاشمی، عبدالقدیر عزم، عابد قادری، دلاور حزیں، سعید فیضانی اور اسمٰعیل ظریف نے کلام سنایا۔

۲۶ ر فروری: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر گیان استھانہ صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ مسٹر اوم پرکاش نرمل سکریٹری ہندی اکیڈمی نے "جدید ہندی شاعر دشینت کمار کی غزلیں" پر مقالہ اور مسز سرینواس لاہوٹی نے "پنڈت سونشی دھر ودیالنکار" پر مضمون سنایا۔ اوم پرکاش نرمل، سرینواس لاہوٹی، منوہر لال بہار، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، رؤف خیر، مدن چند ستنہ، حامد مجاز نے کلام سنایا۔

اقبال پر قیام جرمنی کے اثرات پر عالمانہ اظہارِ خیال کیا۔

۲۰ فروری : بزمِ اردو سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے ممتاز ادیب اور محقق جناب کالی داس گپتا رضا (بمبئی) کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر سجاد حسین رضوی نے گپتا رضا کی علمی و تحقیقی صلاحیتوں اور اردو شعر و ادب سے ان کی والہانہ رفاقت پر اظہارِ خوشنودی کیا اور کتب خانۂ رضا کو ادبیات کا اہم مرکز قرار دیا جناب حبیب شاکر صدر بزم نے تقریب کی صدارت کی۔

۲۳ فروری : ڈاکٹر افضل اقبال لکچرر سکندرآباد کالج کی نئی تحقیقی کتاب "اردو کا پہلا نثری ڈرامہ" شائع ہوئی۔

۲۴ فروری : عثمانیہ یونیورسٹی کے خبرنامہ کے مطابق ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر یوسف سرمست کو پروفیسر کے عہدہ پر ترقی دی گئی ہے اور ڈاکٹر میرزا اکبر علی بیگ کو ریڈر شعبۂ اردو مقرر کیا گیا ہے ادارہ ان اصحاب کو مبارکباد پیش کرتا ہے

۲۵ فروری : عثمانیہ یونیورسٹی نے نامور سخنور جناب سید مصلح الدین شاذ تمکنت کو "مخدوم حیات اور کارنامے" پر اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کا مستحق قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر شاذ نے یہ مقالہ پروفیسر رفیعہ سلطانہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کی نگرانی میں تحریر کیا ہے۔

● اردو سبھا کا ادبی و شعری اجلاس جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے حضرت شمس الدین محمد فیض کی شاعری پر مقالہ سنایا۔ مسرز یعقوب عمر، داؤد نصیب، جیلانی بیگ صادق، راجہ لال راجہ، وحید الحسن ہاشمی، عبد القدیر عزم، عابد قادری، دلاور حزیں، سعید فیضانی اور اسمٰعیل ظریف نے کلام سنایا۔

۲۶ فروری : اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر گیان استھانہ صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں بمقام اردو ہال منعقد ہوا۔ مسٹر اوم پرکاش نرمل سکریٹری ہندی اکیڈمی نے "جدید ہندی شاعر دشینت کمار کی غزلیں" پر مقالہ اور مسٹر سری نواس لاہوٹی نے "پنڈت سوشی دھر وقیا لنکار" پر مضمون سنایا۔ اوم پرکاش نرمل، سری نواس لاہوٹی، منوہر لال بہار، صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، رؤف خیر، مدن چند شستہ، حامد مجاز نے کلام سنایا۔

MAR·CH 1984

N, 10922/57.
H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad 500 004. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد



بالِ جبریل

ضربِ کلیم

مکاتیبِ راشد

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

سب رس



نگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۵۴ شمارہ ۴ سنِ اجراء ۱۹۳۸ء

فون: ۳۸۴۶۹

اپریل ۱۹۸۴ء

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

مجلسِ مشاورت

صدر: عابد علی عباسی

نائب صدر: ہاشم علی اختر

معتمد: ڈاکٹر مغنی تبسم

ارکان:

پروفیسر سید علی اکبر

عابد علی خاں، پروفیسر گوپی چند نارنگ

محمد اکبر الدین صدیقی، رمن راج سکسینہ

محمد منظور احمد

مدیرِ اعزازی: مغنی تبسم

معاون مدیر: وقار خلیل

شریک مدیر: محمد منظور احمد

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ: ہندوستانی کتب خانوں سے: ۲۵ روپے
بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے:

	ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرقِ وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۱۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، بنگلہ دیش، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۲½ پونڈ

سید علی اکبر ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان میں چھپوا کر، حیدرآباد ۲ (اے۔ پی) سے شائع کیا۔

کتابت: رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

سرورق: حضرت میر محمد مومن (دیوانِ سلطانِ قطب شاہیہ)

ترتیب

اپنی بات

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام حسب روایات قدیم "یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب ۱۲ رفروری اور ۱۳ رفروری ۱۹۸۴ء کو شاندار طریقے پر منعقد کی گئیں ادبی اجلاس میں جو مضامین پڑھے گئے تھے ان میں سے چند مضامین زیر نظر اشاعت میں شامل ہیں دیگر مضامین آئندہ شمارے میں شائع کئے جائیں گے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا۔ رام بابو سکسینہ نے محمد قلی کو دکن کا شکسپیئر کہا ہے۔ اس تاجدار شاعر کے کلام کی اہم خصوصیت "موضوعات کا تنوع ہے۔ مغل شہنشاہ اکبر اعظم کی رواداری اور رعایا پروری جہانگیر کا انصاف اور شاہجہاں کی طرح فن تعمیر کے اعلیٰ ذوق نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ وہ پُرگو شاعر تھا اس کے کلام میں ہندوستان کی فضا ہے۔ اس نے اپنی رعایا کے دلوں پر حکومت کی۔ ادارۂ ادبیات اردو کے بانی ڈاکٹر زورؔ نے تقاریب یوم محمد قلی کے ذریعہ محمد قلی کی یاد کو تازہ رکھنے کا اہتمام کیا تھا۔ چنانچہ یہ تقاریب ہر سال پوری سنجیدگی، دلچسپی اور نہایت سلیقے کے ساتھ منعقد کی جاتی ہیں۔ جس سے اردو دنیا میں محمد قلی کے نام اور کلام کا چرچا ہوتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں "گوشۂ محمد قلی قطب شاہ" کے علاوہ منظومات، فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں بیگ احساس کی کہانی "بے سورج آسمان" بھی دعوت مطالعہ دے رہی ہے۔ نقد و نظر کے عنوان کے تحت چند تبصرے معیاری تصانیف کا تعارف ہیں۔ زبان و ادب کی خدمت "سب رس" کا نصب العین رہا ہے۔ اس ماہنامہ کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں ہمیں قارئین کرام کے گراں قدر اور پرخلوص تعاون کی شدید ضرورت ہے۔

——— محمد منظور احمد

صادق نقوی



دکھن کی تہذیب و تمدن
قطب شاہوں کی تاریخ کا روشن باب

شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے بانی محمد قلی قطب شاہ کی یاد کو تازہ رکھنے ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے ہر سال یوم محمد قلی قطب شاہ عظیم الشان پیمانے پر منایا جاتا ہے

تقاریب کے سلسلے کا ایک اہم حصہ ادبی اجلاس ہے۔ اس سال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ ادبی اجلاس کو دکنی ادب تک محدود رکھنے کے بجائے اسے وسعت دے کر قطب شاہی تہذیب و تمدن سے متعلق ابواب کو اجاگر کیا جائے۔

اسی مناسبت سے اس سال اجلاس میں مختلف مضامین سے تعلق رکھنے والے صاحبانِ قلم و دانشوروں کو مقالے پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ ادبی اجلاس میں جن اسکالرس نے اپنے مقالے پیش فرمائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ پروفیسر دھریندر پرشاد۔ صدر شعبہ جغرافیہ نظام کالج
۲۔ پروفیسر کرشنا مورتی صدر شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی
۳۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی لکچرار اردو عثمانیہ یونیورسٹی
۴۔ ڈاکٹر رحمت علی خان کیوریٹر انچارج شعبہ مخطوطات سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد
۵۔ جناب راحت عزمی ۶۔ جناب محمد منظور احمد

محترم ڈاکٹر [illegible] خان صاحب صدر شعبہ اُردو اوپن یونیورسٹی نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ قابل مقالہ نگاروں کے مقالے اسی رسالے میں شائع کئے جا رہے ہیں اس لئے مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھنا ہے۔ آپ خود ہی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ ان میں کا ہر مقالہ علمی حیثیت سے بڑا قیمتی اور معیاری ہے۔ لیکن قطب شاہوں کی دکھن دیس کے لئے عظیم خدمات کا احاطہ محال نہیں

تو مشکل ضرور ہے ۔ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا قیام اس وقت عمل میں آیا جب دکن سیاسی اور سماجی دونوں حیثیتوں سے کشمکش کی منزل میں تھا۔ بہمنی سلطنت کے زوال اور دکن میں ابھرنے والی نئی ریاستوں کے قیام نے دکن کے سیاسی نقشے میں واضح تبدیلیاں لادی تھیں۔ سلطنتوں کے حدود ابھی بنے نہیں تھے اس لئے کشمکش جاری تھی۔ پھر وجے نگر کی ریاست ان ابھرتی ہوئی طاقتوں کے لئے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس سیاسی کشمکش کے ساتھ ساتھ دکن میں سماجی کشمکش بھی واضح تھی۔

دکن کا سماج عمودی اور عاذی دونوں سمتوں میں منقسم تھا مسلم اور غیر مسلم کی تقسیم کے ساتھ ساتھ خود مسلم کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح غیر مسلموں میں کئی ذاتیں اور قبیلے تھے۔ سماج کی دوسری تقسیم ملکی اور غیر ملکی امراء کے درمیان تھی۔ اس ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے سماج کو ایک اکائی میں بدل دینا آسان کام نہ تھا۔ لیکن شاہوں کا دکن کو سب سے بڑا عطیہ ان کی عطا کی ہوئی تہذیب ہے جس نے بکھرے ہوئے اس سماج میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی۔

قطب شاہوں نے دکن میں ایک ایسی تہذیب کی بنا ڈالی جو بھائی چارگی ' مذہبی رواداری ' کشادہ ذہنی پر مبنی تھی۔ انہوں نے اس تہذیب کو نہ صرف اپنایا بلکہ اس کے قدروں کو اتنا واضح کیا کہ یہ دکن کے رہنے بسنے والوں کی فطرت بن گئی۔

اس تہذیب کو پھر سے اجاگر کرنا اور دکن کے رہنے والوں کو پھر سے ان کی روایات کی پاسداری کی طرف راغب کرنا آج کے دور میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ یوم محمد قلی قطب شاہ میں جو مقالے پڑھے گئے ' ان کا رجحان یہی رہا۔

اجلاس میں حیدرآباد کے صاحبان علم ' ادیب ' شاعر اور یونیورسٹی کے اساتذہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور ادبی اجلاس کو ہر طرح سے سراہا۔

اختتام ادبی اجلاس کے بعد "ایوان اردو" میں ۹ بجے شب یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کا سالانہ مشاعرہ جناب یم یل نظم ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم کی صدارت میں آراستہ ہوا۔ جناب رئیس اختر نے نظامت کی۔ وقار خلیل نے محمد قلی پر اپنے سانیٹ سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ علی الترتیب روشن اختر ' منیرالزماں منیر ' راجہ لال راجہ ' قاسم موسوی ' راحت عزمی ' صلاح الدین نیر انور ہاشمی ' رشید شہیدی ' جوہر ہاشمی ' علی الدین نوید ' سریواستو عالم ' اکبر یوسفی ' کنول پرشاد کنول ' بشیر وارثی ' منوہر لال بہار ' ڈاکٹر ثریا طاہرہ سعید ' ڈاکٹر اشرف رفیع ' راز عابدی ' محمد منظور احمد ' فیض الحسن خیال ' الہام اللہ صادق نقوی ' رحمن جامی ' عزیز النساء صبا ' راشد آذر ' سعید شہیدی ' علی احمد جلیلی اور ڈاکٹر نظم نے کلام سنایا۔

ڈاکٹر رحمت علی خاں

قطب شاہی دور کا فارسی ادب

با عظمت و باوقار قطب شاہی بادشاہوں نے جس خوبی و دانشمندی سے اس سرزمین دکن پر حکومت کی وہ فقید المثال ہے۔ میدان کارزار ہو کہ تہذیب و تمدن، قومی یکجہتی ہو کہ نظم و نثر، ہر میدان میں انہوں نے اپنی بزرگی و برتری کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ میرا آج کا موضوع ہے، قطب شاہی دور میں فارسی زبان و ادب کی ترقی لیکن اپنا مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ اعتراف ضروری ولازمی ہے کہ مندرجہ بالا عنوان پر سب سے اچھا کام ڈاکٹر نجمہ صدیقہ صاحبہ لکچرار فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی نے کیا ہے۔ ان کا یہ مقالہ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس خاندان کے بانی اور پہلے بادشاہ سلطان قلی قطب الملک ہمدانی کے متعلق مورخ فرشتہ رقمطراز ہے کہ سلاطین بہمنی ہمیشہ اپنے فرامین میں اسے "صاحب السیف والقلم" لکھتے تھے۔ تواریخ میں اس کی بہادری و بلند حوصلگی و عالی ظرفی کے نمونے تو مل جاتے ہیں لیکن کہیں اب تک اس کی نظم و نثر یا فرمان وغیرہ کے نمونے دستیاب نہ ہو سکے۔

حالات نے کچھ اس طرح پلٹا کھایا کہ سلطان قلی کے بعد اس کا تیسرا لڑکا جمشید قلی قطب شاہ تخت سلطنت پر رونق افروز ہوا۔ اس کی فارسی شاعری اور تاریخی حالات سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں فارسی زبان وادب نے جو بلند ترقی کی ہوگی۔ حضرت علی کی منقبت میں اس نے جو نظم لکھی ہے اس کے چند معرکتہ الآرا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

ای بتو ختم ملک زیبائی — کار عشق از تو یافت بالائی
کاکل و چین زلف و خال رخت — ہر یکی در کمال رعنائی
در رہ عشق ہر کہ پا بنہد — آخر او سر کشد بہ رسوائی
من ز دیوانگی شدم مشہور — تو بخوبی و عالم آرائی

تو ہمان آفتاب بے ہمتا! من ہمان عاشقِ تماشائی

ذہنِ عالی میں یہ بات تازہ رہے کہ مندرجہ بالا شوخ و سادہ اشعار ایک منقبت کی تمہید کے ہیں۔ جمشید کے کئی شعر اور قطعات اور بھی ملتے ہیں جن سے اس کی فارسی سے دلبستگی روشن ہے۔ باوجود شاہی مصروفیتوں کے ادبی و علمی کاموں میں حصہ لینا اور خود شعر کہنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چہ جائیکہ اتنی سلیس اور عمدہ شاعری کرنا۔ جمشید کے کلام کی ایک خوبی اس کی خودداری و بہادری ہے۔ ادبی دنیا کی دو معروف شخصیتیں ملا قاسم طبسی اور شریف متوکلی بھی اسی کے دور میں ... حکمران کی کامیابی کا آفتاب ابراہیم قلی قطب شاہ کے عہدِ زریں میں بامِ عروج پر آیا۔

جمشید کے بعد کچھ ماہ کے لیے اس کا لڑکا سبحان قلی قطب شاہ نے بادشاہت کی لیکن جلد ہی اس کے چچا ابراہیم قطب شاہ نے جو وجیانگر میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہا تھا، واپس آکر تختِ شاہی پر قبضہ کر لیا۔

یہ بڑا سیاست داں، دانشمند اور بہادر بادشاہ تھا جس نے ادبی حلقوں میں بھی گولکنڈہ کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ابراہیم قطب شاہ کے نظم و نثر کے نمونے تو نہیں ملتے مگر اس کی سرپرستی میں فارسی کی جو ترقی ہوئی اس کے کئی ثبوت جا بجا مل جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تلگو زبان و ادب کا اثر و نفوذ بھی اسی کے زمانے سے زیادہ ہوا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشترکہ تہذیب نے بھی اسی دور میں جنم لیا ہو جس نے آگے چل کر محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں معراج پائی۔

اس کے دور کا سب سے اہم کارنامہ "تاریخ قطب شاہی" کا آغاز ہے جو "تاریخ ایلچی نظام شاہ" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس فارسی تاریخ کا بہت بڑا لائحہ عمل مرتب کیا گیا اور خیال یہ تھا کہ خود شاہ بن قباد الحسینی اسے دو ضخیم جلدوں پر ترتیب دیں گے۔

جلد اوّل میں آغازِ کائنات تا ختمِ سلطنتِ بہمنی کی عام تاریخ ہوگی اور جلد دوم صرف پانچ دکنی سلطنتوں اور خصوصاً قطب شاہی دور کا احاطہ کرے گی مگر اتفاق ایسا ہوا کہ پہلی جلد جو بڑے سائز کے زائد از چھ سو اوراق پر مشتمل تھی تیار کر لی گئی مگر کسی وجہ سے جلد دوم منظرِ عام پر نہ آسکی۔ یہ تفصیلی تاریخ بڑی سلیس و فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے اور بہمنی سلاطین کے عہد تک حاوی ہے۔ اس کا قدیم ترین شاہی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں بڑی اچھی حالت میں موجود ہے جو عبداللہ قطب شاہ کی شاہی

لائبریری کے لیے لکھا گیا تھا۔ اسی دور کا دوسرا اہم کارنامہ "انشائے قاسم طبسی" کی ترتیب و تدوین ہے اس مجموعے میں ایسے خطوط اکٹھا ہیں جو یا تو ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے لکھے گئے ہیں یا پھر اس کے نام معنون ہیں۔ یہ نسخہ بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اعلیٰ درجے کی فارسی نثر میں لکھا گیا ہے۔ اس مخطوطے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ملاّ قاسم طبسی اس کے درباری دبیر رہے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا نسخہ بھی کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

شاعر شریف و قوعی گمان غالب ہے کہ پہلے اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔ میر شاہ بھی اسی کا درباری شاعر تھا۔ ان شعراء کا کلام کمیاب ہے۔ ادب و تاریخ سے قطع نظر مذہبیات پر بھی اس دور میں کام ہوا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ خالص، شیعہ تھا اور ان ہی علماء کی سرپرستی بھی کرتا ہے۔ شیعہ مذہب کی تائید میں ایک فارسی رسالہ آج بھی کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تواریخ اس بات پر بھی شاہد ہیں کہ دکھنی اردو کا نشو و نما بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔

ابراہیم قطب شاہ کے فرزند و جانشین محمد قلی قطب شاہ سے عہد قطب شاہی کا سنہری دور شروع ہوتا ہے۔ سیاست، ادب، تعمیرات اور تہذیب و تمدن کے ہر میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے گئے جس کی مختصر سی یاد آج بھی شہر حیدرآباد، چار مینار اور دکھنی کلیات محمد قلی قطب شاہ سے تازہ و معطر ہے۔ یہ ہمہ گیر قطب شاہ آج بھی کئی عشقیہ افسانوں کا مرکزی کردار بنا ہوا ہے خصوصاً حیدرآبادیوں کے لیے تو وہ مثالی بن کر امر ہوگیا ہے۔ یہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا ہم لوگوں پر احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں اس کی یاد تازہ رکھنے کا ایک طریقہ بتلادیا۔ اس کا فارسی کلام ابھی تک نایاب ہے اور جو کچھ ملتا ہے وہ اتنا ہے کہ اس پر تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے فارسی کلام میں حسن کی دلفریب خوشبو، عشق کی چاشنی اور رنگِ حافظ شیرازی کی نمایاں جھلک دکھائی دیتی ہے۔

چند اشعار دیکھئے ؎

لطفے نمودہ، سوئے خود آں نازنین بخواند　　　مارا نہ بے وفائی او، ایں گماں نبود

گہے تغافل و گاہے سلام می سوزد　　　چہ گویمت کہ دلم را کدام می سوزد

دلے کز دست نالان شد پریشان گشت و ویران شد — مسلمانان! مبادا ہیچ کس از دوست فریادی

اے قطب شاہ ما نقد دل خویش چہ گوئیم! — مشتاق ترا ز خویش ندیدیم ندیدیم

من غم عالم ندارم، عاشقی کار منست — بادشاہ کشور عشقم خدا یار منست

چون محمد قطب شاہ از عشق می گوید سخن — عاشقان را آرزوئے طرز گفتار منست

قلی قطب شاہ کے عہد میں کئی جید علماء، اطبا، شعرا و ادبا گولکنڈہ و حیدرآباد آئے، ان سب میں مشہور ترین حضرت میر مومن استرآبادی ہیں۔ آپ شاعر بھی تھے۔ طب میں "اختیارات قطب شاہی" اور ہیئت و ریاضی میں "رسالہ مقداریہ" آج بھی موجود ہیں "اختیارات قطب شاہی" دراصل مشہور طبی کتاب "اختیارات بدیعی" کی تشریح و تنقید ہے اور سلیس فارسی میں لکھی گئی ہے۔ اس کا قدیم ترین مطلّا و مذہب شاہی نسخہ اب کتب خانۂ سالار جنگ میوزیم کی زینت بڑھا رہا ہے۔ رسالۂ مقداریہ ریاضی و طب وغیرہ کا ملا جلا رسالہ ہے جو گمان غالب ہے کہ ان ہی کے تحریر میں ہے۔ دو قطب شاہی مواہیر بھی اس پر ثبت ہیں۔ ان کی سیاست دانی و سوجھ بوجھ سے متاثر ہو کر قلی قطب شاہ نے انھیں اپنا وزیر خاص بنایا تھا۔ ان کا مقبرہ آج بھی پرانے شہر میں مرجوعِ خواص و عوام ہے۔

دوسری اہم شخصیت جو گولکنڈہ کے لیے باعث افتخار بنی وہ مرزا محمد امین شہرستانی کی ہے۔ یہ بڑے ماہر ریاضی و محاسب تھے۔ کئی سال بعد یہ حیدرآباد سے ایران واپس گئے لیکن ہندوستان کی کشش نے انھیں دوبارہ شمالی ہندوستان پہنچا دیا جہاں شہنشاہ جہانگیر اور شاہ جہاں نے ان کی بڑی قدر افزائی کی اور بالآخر وہ مغلیہ سلطنت کے میر جملہ ہو گئے۔ ان کا ایک فارسی دیوان اور کئی مثنویات دستیاب ہیں۔ مثنویات سے تصوف اور فلسفہ کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کے دیوان کا تاریخی نام "گلستان ناز" ہے۔ نمونے کے لیے دو شعر عرض ہیں، ہاں مگر یاد رہے کہ ان کا تخلص "روح الامین" تھا۔

سرفرازی اگر خواہی، چو زلفش، بر زمین سر نہ — کہ با افتادگی ہا، راہ دارد، سرفرازی ہا

در رقص بہ بین، قامت آن سرو روان را — داری ہوس دیدن، اگر جلوۂ جان را

آتش را تیز تر کن آب را بر خاک ریز — شعلہ مرہم می شود، داغ دل پروانہ را

جز طریقِ عاشقی سوئے حقیقت راہ نیست		کافرے گر عشق ورزد پیشِ من گمراہ نیست

اس کے کلام سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہند ایرانی، سبکِ ہندی کا ایک مایہ ناز شاعر تھا۔ اس دور کے دیگر ممتاز شعرا ہیں: حسین الغرسی، حاجی ابرقوی، شریف کاشانی اور محسن ہمدانی۔ اسی دور میں کئی نامور فارسی علما و شعرا جیسے کرنسا سے مسیحا کاشی اور گاہی شیرازی وغیرہ بھی چند ماہ کے لیے حیدرآباد آکر واپس چلے گیے۔

چونکہ محمد قلی قطب شاہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا اس لیے اس کا جانشین و وارث اس کا بھتیجہ محمد قطب شاہ بن محمد امین ہوا۔ قطب شاہی دور کا یہ واحد بادشاہ ہے جس کا مختصر ہی سہی مگر فارسی دیوان دستیاب ہے۔ اس ناقص الطرفین دیوان کی جو سالار جنگ میوزیم کا ایک انمول رتن ہے اور شاید قدیم ترین بھی، کتابت اوائل سترھویں صدی عیسوی میں ہوی ہوگی۔ اس دیوان میں اس نے اپنا تخلص "ظل اللہ" اور "سلطان" استعمال کیا ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے چچا محمد قلی قطب شاہ کا پیرو ہے اور رنگِ حافظ کو سبکِ ہندی میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بتے دارم کہ از لعلش شرابِ زندگی بارد		ز گلبرگِ رخِ رنگینش آبِ زندگی بارد
گفتی کہ از فراقِ سلطان چہ باک دارد		بیدرد ہمچو خویشم پنداشتی و رفتی
مست از بادہ نیست ظل اللہ		سرخوش از بادہ ہائے صحبت اوست
از التفاتِ دلبرِ عالی مقامِ ما		گردون زد است سکۂ شاہی بنامِ ما
لالہ رویاں زغم دہر فراغم دادند		وز شرابِ لبِ خود آبِ حیاتم دادند

اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دکھنی زبان میں بھی شعر کہتا تھا۔

اس دورِ آخر کی مشہور شخصیت ہیں علامہ محمد ابن خاتون عاملی جو محمد قطب شاہ کے دور میں ایران سے گولکنڈہ آئے۔ دبیری کے فرائض انجام دیئے اور بالآخر بہ حیثیت سفیرِ ایران روانہ کیے گئے اور عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں وزیرِ اعظم بنے۔ یہ جید عالم اور مدبر اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ادیب و شاعر بھی تھے۔ آپ نے اپنے استاد علامہ بہاء الدین عاملی کی عربی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا، جو حدیث امامیہ کی ایک مستند شرح ہے۔ اس کے بعد آنجہانی نے "کتاب الامامت" سلیس و رواں فارسی

میں لکھی۔ یہ دونوں مخطوطے آج بھی موجود ہیں۔ شاعری کا نمونہ ملاحظہ فرمایئے ؎

یافت تا رتبۂ گدائی تو! عاملی را خیال شاہی شد

دلا با نیک و بد در ساز و خو کن با شکیبائی کہ شاخ گل کبے با گل گہے با خار می سازد

بے جہالت گئے دل تاریک ما روشن شود پر تو خورشید باید ظلمت ویرانہ را

محمد قطب شاہ کے دور کا ایک اور یادگار کارنامہ "تاریخ محمد قطب شاہ" کی تالیف ہے۔ مولف کا نام معلوم نہیں لیکن اس میں ابتدائے سلطنت قطب شاہی تا ۵ جلوس محمد قطب شاہ تفصیلی حالات دیئے گئے ہیں۔ تاریخی اور ادبی اہمیت سے قطع نظر اس مخطوطے کی خصوصیت یہ ہے کہ محمد قطب شاہ کے کلام کا کافی انتخاب دیا گیا ہے اور سب سے آخر میں مراد اصفہانی کا ایک قصیدہ در مدح حیدرآباد بھی لکھ دیا گیا ہے۔ اس دور کے دیگر مشہور فارسی شعرا میں حسینی طبسی، ادای یزدی، عشرتی یزدی اور کوکبی۔

عبداللہ قطب شاہ کے دور سے عہد زوال کا آغاز ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کی وجہ صرف عبداللہ قطب شاہ تھا۔ حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ یہ علم و ہنر کا شیدائی اور علماء اور شعراء کا سرپرست کچھ بھی نہ کر سکا۔ مرہٹوں اور مغلوں کی یورش اور اندرونی پھوٹ نے بالآخر اس سلطنت کو ختم کر دیا۔ عبداللہ قطب شاہ کا دکھنی دیوان تو موجود ہے مگر اس کا فارسی کلام نہیں ملتا۔ البتہ اس دور کے چند مشہور نام پیش کیے جاتے ہیں جنھوں نے فارسی زبان و ادب کی اس دور میں خدمت کی۔

ابن خاتون کا ذکر گذر چکا ہے دوسری اہم شخصیت محمود حسین تبریزی کی ہے۔ جنھوں نے حیدرآباد میں پہلی مرتبہ فارسی کی ایک ضخیم و جامع لغت مرتب کی۔ یہ وہی لغت ہے کہ جس پر آگے چل کر مرزا غالب نے کئی اعتراضات کئے اور اسے متنازعہ فیہ قرار دیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے ایما ہی پر یہ لغت ترتیب پائی تھی۔

ایک اور اہم نام حاجی عبدالعلی طالقانی ہے جو درباری دبیر تھے۔ ان کی کتاب "انشائے طالقانی" دراصل فرامین و خطوط تاریخی کا ایک مجموعہ ہے جو نثر فصیح فارسی میں سمو دیا گیا ہے۔ اسی زمانے کی ایک مشہور تاریخ حدیقۃ السلاطین ہے جس کے مصنف مرزا نظام الدین احمد الصاعدی شیرازی ہیں۔ مخطوطہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ بھی دو حصوں پر مشتمل رہی ہوگی حصہ اول تو شائع بھی ہو گیا ہے مگر حصہ دوم ہنوز لاپتہ ہے۔ مرزا احمد بھی اسی زمانے کا ایک طنز نگار

تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور کا مشہور شاعر فرج اللہ شوستری ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

مغان کہ زدانۂ انگور آب می سازند ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

بے رخت از رنگ خود گل چون گیاہ افتادہ است بو میان غنچہ چون یوسف بہ چاہ افتادہ است

اسی عہد میں محمد شاہ جامی شاعر نے "کوک شاستر" کا فارسی ترجمہ کیا۔

ان شعراء و ادباء کے علاوہ فارسی کے کئی شاعر مثلاً میر رضی دانش مشہدی، رونقی ہمدانی، سالک یزدی، حمزہ استرآبادی اور سعید کاشانی یہاں رہے اور ترقی کی۔

آخری تاجدار گولکنڈہ ابوالحسن تاناشاہ کا دور بڑا پُرآشوب رہا لیکن کتنی حیرت کی بات ہے کہ اسی دور میں ایک ایسا تذکرہ لکھا گیا جس نے رہتی دنیا تک قطب شاہوں اور ان کے امراء کے نام کو بقائے دوام بخش دی۔ ہمارا اشارہ "حدایق السلاطین فی کلام الخواقین" کی طرف ہے جسے علی بن طیفور بسطامی نے ترتیب دیا اگر یہ تذکرہ نہ ہوتا تو ہم دکن کے کئی سلاطین و امراء کے فارسی کلام سے محروم رہ جاتے۔ یہ عام ہندوستانی فارسی طرز میں لکھا گیا ہے جس کا اصلی نسخہ اب نہیں ملتا۔

کتب خانہ سالار جنگ کا نسخہ تقریباً ۱۹ ویں صدی عیسوی کا ہے۔ علی بن طیفور کی دو اور تصانیف آج بھی دستیاب ہیں۔ اسی دور کے دو اور شاعر ہیں:

وحشی کاشانی و عابس اصفہانی۔

ڈاکٹر عقیل ہاشمی

محمد قلی کی شاعری کا سماجی پہلو

دنیائے شاعری خصوصاً اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے گا اس وجہ سے نہیں کہ وہ ایک عالی مرتبت حکمراں تھا بلکہ اُردو زبان و ادب کے اولین معماروں اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل شاعروں ادیبوں کا مربی و سرپرست ہوتے ہوئے خود بھی ایک قادر الکلام شاعر تھا جس نے لشکری زبان کی بُن بنیاد ہی سے اس کی ترقی و ترویج میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی اور اس زبان کے سرمایہ میں اپنے جواہراتِ تخیل کے وہ گہر آب دار جمع کر دیئے کہ اس زبان و ادب کا دامن اس گراں بہا دولت سے مالا مال ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان ہمہ گیر آفاقیت کی حامل ہو گئی۔

کسی بھی زبان کی توسیع و اشاعت میں جہاں داخلی تحریکیں کام کرتی ہیں وہاں بیرونی عوامل بھی سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ پھر انفرادی حیثیتیں، فعال شخصیتیں اس کے سنوارنے، نکھارنے میں بڑی کارگر، موثر اور ذمہ دار ہوتی ہیں۔ اُردو زبان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا۔ اس زبان کی شروعات اور پھیلاؤ سے متعلق مختلف نظریات کے باوصف دکن میں جب اس کو شاہان عادل شاہیہ و قطب شاہیہ کی سرپرستی حاصل ہوئی تو اس نے اپنے جوہر نکالے۔

دکن میں یہ زبان عوام و خواص اور خود شاہوں کی چہیتی، من پسند زبان تھی۔ ان لوگوں نے اس زبان ہی میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور اس میں ایک طرح کی طمانیت، سکون و آسودگی محسوس کی۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کو تو اس زبان سے ایک والہانہ عشق تھا۔ حسن و عشق کے متوالے اس بادشاہ نے اس زبان کے ذریعے اپنے عشق اور حسن پرستی کو دوامی رنگ بخشا۔ اس کی شاعری کا سب سے اہم پہلو اس کے شاعرانہ خیالات ہے۔ جمالیات

کے ہمراہ سماجیات کا اظہار ہے۔ وہ فنونِ لطیفہ کا دلدادہ، علم و فضل میں یگانہ، روزگار کھیل کود کا شوقین تھا۔ ویسے مطالعہ و مشاہدہ کا خوگر تھا۔ اظہارِ خیال کی آزاد مشربی سے واقف۔ بسیار نویس بھی، اصنافِ شاعری میں شاید ہی کسی صنفِ سخن پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ علاوہ اس قدیم زبان یا دکنی شاعری میں کسی شاعر نے سماجیات کے موضوع پر اس سے قبل کوئی اور ایسی شخصیت نہیں دکھائی دیتی، جس نے زبان و بیان کے ان ابتدائی مرحلوں میں غنائی (LYRIC) اور موضوعاتی (SUB-JECTIVE) نظموں کی فراوانی میں تغزّل کا رنگ، جمالیاتی حسیات، حقیقت پسندانہ پیرائے کے دوش بدوش رسم و رواج عوامی تقریبات پر بڑی چابکدستی و مہارت سے قلم اٹھایا ہے اس ضمن میں کلیات محمد قلی کے اولین مرتب ڈاکٹر زور تحریر کرتے ہیں:

> اس عظیم الشان شاعر کے کلام میں غریبوں کی زندگی عوام کے معتقدات، عقیدوں اور تہواروں، کھیل کود اور تماشاؤں، بازاروں اور بیوپاروں ہندوؤں، مسلمانوں سب کے عام رسموں اور رواجوں کی جھلکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں اس نے ایسے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، جن پر عام شاعروں کی نظر نہیں پڑتی۔ (کلیات محمد قلی صفحہ ۱۴)

دراصل شاعری میں قوتِ متخیلہ اور محاکات کا معاملہ ہمیشہ وجدانِ طبع اور مذاقِ سخن کا مرہونِ منت رہا ہے اور یہ باتیں راست احساس اور مشاہدے سے متعلق رہی ہیں نیز زبان و بیان پر کامل دسترس اس کا خاصہ ہوگا۔ شاعر کے ہاں انفرادی جذبہ یا خیال یا تاثر کا قرینہ بڑی حد تک ذاتی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے جذبات اجتماعی حسن و خوبی سے مبرا بھی نہیں ہوتے۔ سماجیات کے طالب علم جانتے ہیں کہ فرد کی حرکات و سکنات، اس کی سرگرمیاں، اس کے جذبات اور تاثرات سماجی ماحول ہی کے پروردہ ہوتے ہیں۔ اس کے خالص شخصی، نجی اور ذاتی رجحانات بھی اسی ماحول کی عکاسی کرتے ہیں جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ ان تمام احساسات میں ترقی یا تنزّل کا باعث بھی یہی ماحول ہوگا یعنی فرد کی جسمانی ذہنی کیفیات و خصوصیات کی نشو و نما راست سماج ہی سے متعلق رہی ہے۔

گویا تہذیب و تمدن، ادب و ثقافت کی اساس انسانی طرزِ معاشرت، رہن سہن نشست و برخاست، زبان و ادب کا سماج سے گہرا ربط و تعلق ہے اور اگر کوئی فرد اپنی ذات کو ملک و قوم کیلئے وقف کر دے اس کی تمام اعلیٰ قدروں کو اپنا سرمایہ افتخار بنا لے تو یہ اس کی زندگی کا واضح سماجی پہلو ہوگا۔ گو یہ ساری باتیں ہمیں تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہو جاتی ہیں، لیکن جہاں تک

تاریخ نویسی کا معاملہ ہے، مورخین نے اسے واقعات کی کھتونی سے سوا نہ رکھا' ان پر تنقید یا تنیس کو کبھی اپنا منصب نہ جانا' بالفاظ دیگر تاریخ انسانی اعمال و افعال کے ایسے داخلی اور خارجی تذکرہ کا نام ہے جس میں حقیقت نگاری اور افسانوی دونوں طرح کے اسلوب ملتے ہیں' ان پر جذباتیت کی چھاپ ہوتی ہے مگر ادب و شاعری تاریخ نہیں' یہ فکر انسانی سے مملو تہذیبی ثقافتی قدروں کی سچی داستان کے اعلیٰ ترین اظہار کا دوسرا نام ہے اور سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ان ہی سچی داستانوں کو اپنی شاعری کا میڈیم (MEDIUM) واسطہ اور ذریعہ بنایا ہے۔ اپنے تیس سالہ دورِ حکومت میں اس نے قدیم اردو یا دکنی زبان کی ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ وہ بامِ عروج پر پہنچ گئی۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری میں جن موضوعات کو نظم کے دائرہ میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے' وہ خالصتاً زندگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اور ان کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ عوامی رسم و رواج سے ہے۔ اس کی نظموں میں جہاں موضوعات کی رنگینی ہے وہیں ان موضوعات کی مناسبت سے الفاظ کا برتاؤ' جذبات کا رچاؤ ملتا ہے۔ شاید وقت' مزاج اور موقعہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے موزونیت سے اپنے تخلص بھی بدلے۔ چنانچہ کلیاتِ محمد قلی میں اس کے کوئی (۱۲) تخلص بتلائے گئے ہیں۔ اتنے سارے تخلص کا اختیار کرنا ایک لایعنی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ محمد قلی نے اتنے سارے تخلص استعمال کئے ہوں یا نہ کئے ہوں' قطب شاہ معانی اور ترکمان جیسے تخلص یقیناً انہی کے اندازِ فکر' اسلوب' آہنگ اور اس کی ہمہ رنگ طبیعت کے آئینہ دار ضرور ہیں۔

محمد قلی کے کلام میں سادگی اور اپنائیت کا جو تلازمہ (ASSOCIATION) ملتا ہے وہ انوکھا ہی نہیں بلکہ بڑا متنوع بھی ہے۔ عیش و عشرت کی فراوانی انسان کو مختلف مشاغل کا عادی بنادیتی ہے۔ ایسے وقتوں میں انسان کا جمالیاتی و روحانی ذوق و شوق بڑی شدت سے اُبھر آتا ہے' اس منزل پر مختلف طبائع' مختلف جہتوں میں اپنی صلاحیتوں کو روبہ عمل لاتے ہیں' ان میں شاعری بھی ایک ایسے ہی جذبہ کا نام ہے جو لذت و آسودگی اور تسکین سے عبارت ہے اس میں کسی جذبہ اور احساس کا بار بار اعادہ ممکن ہے یہ تہذیب النفس اور شائستگی آفاقیت سکھاتی ہے چنانچہ محمد قلی نے شاعری کو اپنے مزاج بلکہ اپنی روح سے ہم آہنگ کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں اگر ایک طرف جدت طرازی معنی آفرینی کا تیکھا پن ملتا ہے تو دوسری جانب

شاہانہ طمطراق، جمالیاتی ذوق و شوق بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے سارے کلام پر ریختہ شیرینیت کے ساتھ ساتھ مقامی تہذیب و معاشرت کے واضح نقوش دکھائی دیتے ہیں جس کو دیکھنے سے اس دور کے طور طریق، عوام اور ان کا مزاج شاہانہ سرپرستیوں کا ایک مرقع نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ اس نے اپنے کلام میں واقعہ نگاری یا حقیقت پسندی کو اپنے احساسات، مشاہدات اور تجربات کی اساس بنایا ہے اس کے کلام کا بیشتر حصہ خارجی موضوعات کا حامل ہے لیکن اس میں بھی جو داخلیت ملتی ہے وہ انوکھی اور دلآویز ہے۔

مثلاً شادی بیاہ کے موقعے پر رسموں، رواجوں کی دھوم دھام اور اس کی کیفیتوں کو محمد قلی نے بڑے چاؤ سے برتا ہے۔ یہ رسمیں دکن کی تہذیب میں کچھ اس قدر قبولِ عام کی سند پا گئی ہیں کہ ان چیزوں سے چشم پوشی کر لی جائے تو خوشیوں اور مسرتوں میں کسی شے کے کھو جانے کا شدید احساس ہوتا ہے۔ محمد قلی نے ان خوشگوار لمحوں اور کیفیات کی ادائیگی میں کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع نہیں دکھائی دیتا بلکہ ان موضوعات کے اظہار میں نسوانی خواہشات، حسن و رعنائی اور اس کی تمام ترخوبیوں، نزاکتوں کا خیال رکھا۔ جلوہ کی رسم سے متعلق اسکا خیال دیکھئے:

پرم پیاری کا جلوہ کاڑ سارے — اسے چند سور سوں پیاں سنگارے
سہاگاں بھاگ پھل منک پھلے ہیں — سہیلیاں آرتی تار سے نوارے
دیا، دو تخت جلوے کا خوشی سوں — کہ چندر چدک موتیاں سوں سنوارے
چڑاؤ نیل اب ساتو سہاگاں — مشاطہ ہو کے زہرہ ہت نگارے
پلا شربت دیلو وہا تاں میں بیڑے — بندا و دساڑیاں موتیاں کنارے

سلطان محمد قلی قطب شاہ اردو کے اولین شاعروں میں بھی مہتم بالشان تھا اور آج بھی اس کی یہ انفرادیت باقی ہے زمانہ کے بُعد و قدامت کے باوجود آج بھی وہ اپنے کلام کے ذریعہ داد و تحسین حاصل کرتا ہے۔ محمد قلی کی شاعری اصل میں جذبات و احساسات کی زبان، روشنی دل و نگاہ کی ترجمان ہے۔ اس کے کلام میں سوز و گداز، فکر کی گہرائی، درد و غم کی فراوانی ہے نہ تشریت، بلکہ اس کا کلام عیش و نشاط، راگ و رنگ کی رعنائی اور تازگی، سیرابی و سرمستی کا نمائندہ ہے۔

گو تہذیب و تمدن کی وہ جھلکیاں جو ہمیں ماضی کی عظمت اور اس عظیم ورثہ کی جانب توجہ دلاتی ہیں، اس کے کلام میں جا بجا بکھیر پڑی ہیں جس سے یگانگت، بھائی چارگی، ہمدردی، پاس و لحاظ، ادب و احترام اور ایسے ہی تعداد جذبوں کی تصویر ابھرتی ہے دراصل محمد قلی ہندوستانیت کا بہت بڑا رسیا

اعلیٰ کا پرستار تھا۔ اس کی رگ و پے میں ہندوستانی تہذیب رچی بسی تھی وہ ایک تلنگی ' بھاگیہ رتی ' کا بیٹا تھا اتحاد پسندی اور رواداری اسے ورثہ میں ملی تھی اسے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب سے وہی مناسبت تھی جو کبھی اکبر اعظم اور امیر خسرو کو تھی اگر ہم پچھلی تہذیبوں کے متعلق کچھ بات کرتے ہیں تو محض اس لئے کہ ان سے ہمارا تہذیبی اور ثقافتی رشتہ ہے اور ہم اس دور کی عظیم شخصیتوں ' ان کے کارناموں سے زیادہ ان کے اعلیٰ تخلیق و تشکیلی قدروں ' اصولوں و ضوابط سے استفادہ کرتے ہیں ' چنانچہ محمد قلی نے اسلامی عیدوں کے متوازی ہندوستانی عوام کے طور طریقے ' رسومات ' معتقدات اور توہمات کے ساتھ ساتھ ان کے عیدوں ' تہواروں ' کھیلوں ' تماشوں ' موسموں وغیرہ کے بارے میں بیشتر نظمیں کہی ہیں جیسے بسنت ' نوروز ' آمد برسات ' دیوالی ' سالگرہ جلوہ وغیرہ۔ یہ نظمیں ملک میں بسنے والے مختلف طبقوں اور گروہوں کی خوشنودی کیلئے بھی ہوتیں اور طبیعت کی سرخوشی کے لئے بھی۔ ان نظموں کے ذریعہ غیر مذہب کے عوام سے روادارانہ سلوک ' رسم و راہ ' ان کے خوشیوں غموں میں شرکت ' ان کے تحفظ کا خیال ' غرض بہت ساری ایسی باتیں ہیں ' جو اس بات کی دلیل ہے کہ محمد قلی عوام و خواص کے مابین کوئی فاصل نہیں رکھنا چاہتا تھا وہ اس مشترکہ تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا جو صحیح معنوں میں بہمنی بادشاہوں کی دین تھی دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین یگانگت ' اتحاد اور اخوت پیدا کرنے کی جو مثبت کوشش شاہان بہمنیہ نے کی تھی وہ گولکنڈہ میں پروان چڑھی ' علی الخصوص محمد قلی نے اس کو کمال اوج پر پہنچایا۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک بیدار مغز بادشاہ بھی تھا جس نے ہمیشہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا۔ وہ ملک کو امن و آشتی ' علم و ادب کا گہوارہ بنانا چاہتا تھا ' جس سے قومی یکجہتی کا جذبہ ابھرتا رہے ' اس کی شاعری میں مذہبی رنگ ہوتے ہوئے بھی تنگ نظری ' عصبیت نام کو نہیں تھی بلکہ مذہبی عقائد کے قطع نظر رحم دلی ' عفو درگذر ' ملنوث چاہت ' جذبۂ ایثار و قربانی ' سچائی ' نیکی اور محبت ' رواداری کا پر تو صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح وہ ایک انسان دوست ' آفاقی فکر و نظر کا حامل شاعر اور حکمراں رہا ' جس کے ہاں انسانی جذبات کا احترام ان کی قدر و منزلت ہے۔ احترام آدمیت کا وصف ' محمد قلی کی شاعری کا نقطۂ عروج ہے ' اس نے اپنے دور کے علمی ' تہذیبی ' ثقافتی ' سماجی ' ذہنی ' نفسیاتی پس منظر اور پیش منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کے شعور و احساس کی فنہ داری کو پیدا کیا۔ محمد قلی گولکنڈہ یا قطب شاہی تمدن و معاشرت کا ایک ایسا عظیم قلعہ بند ہے جس کے عہد میں عوامی رسم و رواج کو غیر معمولی بڑھاوا ملا اور باقی رسوم تو اس کے بعد بھی '

صدیوں تک باقی رہے اور بعض خالص ہندوستانی تہواروں کو اس نے بین قومی تقریب کی حیثیت سے رائج کیا، اس سے اس کی رنگا رنگ شخصیت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس تہذیب کو آج دکنی تہذیب و معاشرت کہا جاتا ہے وہ اسی متوالے حکمران، شاعر کی دین ہے۔ قدیم زمانے میں سماجی زندگی دو الگ الگ گروہوں یا جماعتوں میں تقسیم تھی ایک اعلیٰ طبقہ جس کا تعلق بادشاہ وقت سے ہوتا، دوسرا علاقائی گروہ جو علاقائی رہن سہن اور زبان کا عادی ہوتا تھا، اپنے جذبات و احساسات کو اپنے مخصوص طرز و انداز کے ذریعے ظاہر کرتا تھا۔ محمد قلی نے ان دونوں طبقوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مشترک انداز وضع کیا جس میں خواص کی روایت کو عوامی سطح پر لے آنے کی کامیاب کوشش کی جہاں عوام اور خواص دونوں فکر و اظہار میں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس سماجی میل جول اس کی ترویج و توسیع سے اس کا منشا یہ تھا کہ اہل ملک کو سال بھر میں مختلف مواقع حاصل ہوں جن میں وہ خوشی و انبساط کے جذبات کا اظہار کر سکیں اس کے لئے محمد قلی نے سرکاری طور پر سال بھر کے لئے بارہ چودہ ایسی تقریبوں کو مقرر کیا جو سرکاری اہتمام سے منائی جاتی تھیں۔ ان میں عید میلاد، عید بعثت نبی، عید مولود کعبہ، عید غدیر، شب برات، شب معراج، عید رمضان، عید الضحیٰ یا بقر عید، مرگ سال یا آغاز برسات، نوروز، بسنت، سالگرہ وغیرہ۔ ان تقریبات میں موخر الذکر چار تقریبوں میں لوگ بلا تفریق مذہب و ملت شریک ہوتے تھے۔ ان عوامی جشنوں کے بارے میں اس کے کلیات میں متعدد نظمیں ملتی ہیں یہی نہیں بلکہ اس نے اپنی شاعری کو صرف ادب کے مخصوص اصناف تک محدود نہ رکھا بلکہ حیات و کائنات کی ہر چھوٹی بڑی، اہم اور بسا اوقات غیر اہم بات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ اس کا یہی انداز و اسلوب فکر و نظر کے اعلیٰ تخیلاتی محل نے اسے سرزمین دکن ہی نہیں، بلکہ اردو کا عظیم شاعر بنا دیا۔ بسنت سے متعلق شعر دیکھیے ؎

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا   تمہیں ہیں چاند میں ہوں جوں ستارا
بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں   کہ اسماں رنگ شفق پایا ہے سارا
نچھل کندن سے تھے رنگ جھوٹا   بندی ہوں چھند بند سوں کر سنگارا
نبی صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ   رنگیلا ہور ہیا ترلوک سارا

جست مانک سوں بسنت کے گل کھلے عالم منے   پھول بسنت تھے سب فلک لال رنگ چھایا بسنت
کرتیاں رقص آ حوراں ہر یک ترل چند سوراں   جھلکے ہر طرف نوراں سو تن ابھرن کے جوہر ۔۔۔

(باقی صفحہ ۲۵ پر دیکھیے)

راحت عزمی

عہدِ قطب شاہیہ کے پیشوا :

علامہ ابنِ خاتون

قطب شاہیوں کا مزاج ہر حکمراں سے جدا تھا۔ وہ جسموں کے بجائے دلوں پر حکومت کرتے تھے اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان ہیروں کو تراشنے میں اللہ کے نیک بندوں نے اپنا حق ادا کیا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ قدرت نے ان بادشاہوں کے سینے میں محض دل نہیں رکھے تھے بلکہ پیار اور محبت کی شراب کے چھلکتے ہوئے پیمانے جڑ دیئے تھے۔ ان کے گداز قلب کا یہ عالم تھا کہ کسی کے چوٹ لگتی ان کی آنکھ بھر آتی۔ ان سب کی آرزو یہی تھی کہ ان کے ممالک محروسہ میں ہر طرف انسان ہی انسان نظر آئیں۔ یہی تمنا محمد قلی قطب شاہ بانی حیدرآباد کے لبوں پہ اس طرح دعا بن کر آئی ہے:

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر — رکھیا جوں توں دریا میں من یا سمیع

یہ بادشاہ اپنے اور عوام کے درمیان راعی اور رعایا کے مقابلے میں ماں باپ اور اولاد کے رشتے کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ وہ فطرتاً انسان دوست تھے۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کون کس فکر و خیال اور عقیدہ و مذہب کا ہے۔

سلاطین قطب شاہیہ کٹر مذہبی تھے۔ اسی لیے وہ زیادہ سیکولر ذہن کے حامل تھے۔ انسانوں سے محبت کرنا اور انہیں ٹوٹ کر چاہنا بھی دراصل اسی مذہبی کٹرپن کی دین ہے کیوں کہ انہوں نے مذہب کی روح کو ایسی بلندی اور وسعت نظر سے دیکھا تھا، جس بلند نگاہی اور وسیع النظری سے وہ دیکھے جانے کا مستحق تھا۔ "سب اللہ کے بندے ہیں" یہ حقیقت ان کے ذہنوں میں پیوست تھی۔ "جس کا دین اس کو پیارا" ان کی فکر کا بنیادی اصول تھا۔ اسی لیے ان کے ابرِ کرم کی بارش سے بارانِ رحمت کی طرح سب ہی یکساں طور سیراب ہو رہے تھے۔ وہ انسانوں کو خانوں میں بانٹنے کے کبھی قائل نہیں رہے۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ سلاطین اونچے درجے کے کامیاب حاکم تھے انہوں نے دکن کی تہذیب و ثقافت

کو پیار کے رس سے گوندھ کر سنوارا تھا اسی لیے آج بھی دکنی تمدن میں شائستگی کے ساتھ پیار کی خوشبو بھی ہے۔

ان بادشاہوں کی نگاہیں نفسیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں پر بڑی گہری تھیں۔ وہ سماج کے نازک، حساس اور پیچیدہ مسائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرتے تھے انہوں نے تمام مذاہب کی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا جائزہ لیا۔ ان کے برتاؤ کے سلیقہ کو سمجھا۔ اس کے بعد اپنی منصوبہ بند تمدنی قدروں کو ان مذہبی اقدار کی روشنی میں رائج کرنے کے عملی پہلو بڑی خوبصورتی سے وضع کیے۔ دکنی تمدن کا جائزہ لیجئے۔ یہاں سب لوگ اپنے اپنے عقیدوں پر سختی سے قائم رہتے ہوئے بھی باہم شیر و شکر نظر آئیں گے۔

تمدنی اقدار کو جاوداں بنانے کے لیے انہوں نے غم کو مرکزی حیثیت دی کیوں کہ دل کا گداز غم سے عبارت ہوتا ہے۔ اسی گداز میں وہ مقناطیسیت ہوتی ہے جو ہر انسان دوست ذہن کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہاں کے عیدوں، تہواروں، جاتراؤں اور عرسوں میں ہندو مسلم یگانگت کے جو مظاہرے نظر آتے ہیں وہ قطب شاہی تہذیب کا حاصل ہیں۔

روزمرہ زندگی میں بھی دکن دیس میں میل ملاپ، اخوت و برادری، دوستی اور بھائی چارگی جس بلندی سے یک قومی نظریہ پر ایقان کا مظاہرہ کر رہا ہے وہ آج کے قومی یکجہتی کے فلسفے سے زیادہ متاثر کن ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گھروں کی چسپیدہ دیواروں، شیر سنگھ اور شیر خاں، محبوب نارائن اور محبوب حسین جیسے ناموں کے اشتراک سے یک قومی جذبہ کی جو روشنی پھوٹ رہی ہے، اس کی چکاچوند اتحاد کے کسی اور نقطۂ نظر میں دکھائی نہیں دیتی۔

یہ صحیح ہے کہ جوہر کی عطا قدرت کے ہاتھ ہے۔ "خدا کی دین ہے جسے چاہے جسے دے" لیکن اس فکر و عمل کو تراش کر جگمگا دینا، ماہرین فن کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ چنانچہ ان سلاطین کے جوہر انسانیت کو چمکانے میں حضرت میر محمد مومن استرآبادی علیہ رحمہ اور علامہ ابن خاتون علیہ الرحمہ کی بڑی کاوشیں رہی ہیں۔ یہ قلندر صفت بزرگوار وہ تھے جن کے قدموں پر دنیا لوٹ لوٹ کر اس کی طرف دیکھنے کی آرزومند تھی اور وہ اسے ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتے تھے۔

علامہ ابن خاتون حضرت میر محمد مومن جیسی بلند شخصیت کے رشید شاگرد تھے انہوں نے علوم حق کی خاموش خدمت کی ہے۔ خصوصاً علم کی تدوین و ترتیب و نشر و اشاعت میں زندگی بھر سرگرم رہے۔ [illegible] کا ابتدا [illegible] کیا ہے [illegible] ہے۔ [illegible] ملی۔

[illegible] آملی

کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا البتہ اتنی صراحت کردی ہے کہ آپ جبل عامل (عراق) کے ایک قریہ میں پیدا ہوئے۔ "شمس الدین ابوالمعالی محمد معروف بہ علامہ ابن خاتون در قریہ جبل آمل در دنیا آمد۔"

(نظم و نثر در زمان قطب شاہی ص ۱۷۷)

آپ باد پیمے اور علمی گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی والدہ مجتہد عصر علامہ شیخ بہاؤالدین آملی کی بہن تھیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اپنی والدہ کی نسبت سے آپ ابن خاتون کہلاتے ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ

سبب نسبت بہ خاتون آنست کہ یکی از سلاطین دختر خود
را بہ یکی از آباء ایشاں دادہ بود و ایشاں از نسل آن خاتون اند } ایضاً ص ۱۷۷

صاحب حدائق السلاطین یوں رقم طراز ہیں: "گویند، چوں جد بزرگوار شیخ عالی مقدار یکی از خواتین قبیلۂ نامدار بحبالہ نکاح داشتند از آن زمان درمیان آن تازیان آں طبقہ با بن خاتون ملقب گشتند۔" (مخطوطہ ورق ۱۹۴ ل)

علامہ ابن خاتون نے اصفہان یا مشہد میں علوم متداولہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ آپ اپنے ماموں علامہ شیخ بہاؤالدین کے خاص شاگرد بھی تھے اور چہیتے داماد بھی تھے۔ تحصیل علم کے بعد آپ گولکنڈہ آئے۔ ڈاکٹر رضیہ اکبر نے لکھا ہے کہ "در اصفہان تحصیلات را تمام کردہ و در سنہ ۱۰۰۹ ہجری بہ گولکنڈہ رسید۔"

حدائق السلاطین میں ہے: "از زمرہ علمائے دانشور و فرقۂ فضلای بلاغت گستر بود علوم دینی و معارف یقینی را اکثر در مشہد مقدس منور رضویہ تبلمذ از خاتم المجتہدین شیخ بہاؤالدین...... استفادہ نمودہ .... جملاً جناب شیخ ...... از مشہد رضویہ بجانب دکن شتافت در سنہ ہزار و نہ داخل بلدہ حیدرآباد برحسب تقدیر در سلک خواص ملازمان سلسلہ ... قطب شاہیہ اختصاص یافت (ورق ۱۹۴ ب)

اس زمانہ میں مسند حکومت پر مجتہد بادشاہ محمد قطب شاہ متمکن تھا۔ یہ بادشاہ بڑا علم پرور تھا۔ صاحب حدائق کا کہنا ہے کہ "بادشاہی بود و دانشور و شہنشاہی عدل گستر و فضل و کمال سرآمد..... از اقلیم علوم عقلی و نقلی آگاہی تمام داشتہ ..... با ارباب فضیلت و اصحاب حکمت صحبت داشتہ .... از فنون دانش بہرہ مند.... بارگاہش مجمع خردمندان کامل عیار و درگاہش مرجع واردان ہر دیار (ورق ۱۱۵ ب ۱۱۶ ب)

علامہ ابن خاتون گولکنڈہ وارد ہوتے ہی بادشاہ کی مصاحبت میں داخل ہو گئے۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں پیشوائے سلطنت حضرت میر محمد مومنؒ کی سفارش کو دخل رہا ہو بلکہ یہاں تک بھی ممکن ہے کہ علامہ آپ ہی کی ایماء سے دکن آئے ہوں کیونکہ علامہ کو میر محمد مومنؒ سے نہ صرف عقیدت ہی تھی بلکہ تلمذ بھی تھا۔ "از میر مومن استرآبادی عقیدت زیادہ داشتند (نظم و نثر در زمان قطب شاہیہ ص ۴۴)

"شیخ ابن خاتون کہ در بعضی مطالب علوم تلمذ جناب میر نمود" (مخطوطہ حدایق السلاطین ورق ۱۸۸ ا)

حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ کو بھی علامہ سے بے حد محبت تھی۔ یہ جوہر قابل اس قابل تھا کہ اسے سینہ سے لگایا جاتا۔ حضرت میر محمد مومنؒ بڑے مردم شناس تھے۔ اس کے علاوہ وہ صاحب کشف بھی تھے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ حضرت اپنے بعد جانشین کی تربیت خود کر رہے ہوں کیونکہ مد تعفائے ممالک کا عہدہ بڑا جلیل القدر عہدہ تھا اور اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک تھیں۔ غالباً آپ ہی کی سفارش پر علامہ ابن خاتون قطب شاہ کے ایلچی بن کر ایران گئے تھے۔

در عہد ..... سلطان محمد قطب شاہ بایلچی گری ایران رفت (ایضاً ورق ۱۹۴ ب)

میر عالم حدیقۃ العالم میں لکھتے ہیں۔ "در اواسط ذی قعدہ ۱۰۲۵ اہر فضیلت جاب وکمالات انتساب مجمع فضائل گوناگوں شیخ محمد بن خاتون سا کہ از عمدہ مجلسیان و مقربان درگاہ بود ..... باتفاق حسین بیگ کہ چہار ہزار ہون جہت خرچ راہ باو مرحمت شدہ بود از راہ برہان پور روانہ جانب ایران نمود۔ (ورق ۲۰۷ ب)

ایران میں آپ نے گیارہ سال قطب شاہی سفارت کے فرائض انجام دیئے اور ۱۰۲ میں حیدرآباد واپس ہوئے۔ اس وقت یہاں سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ حضرت میر محمد مومن قبلہ نے کمال تدبر سے عبداللہ قطب شاہ کو تخت سلطنت پر بٹھا دیا تھا۔ اس وقت شہزادے کی عمر ۱۲ سال کی تھی۔ اتفاق سے اسی سال حضرت میر محمد مومن پیشوائے سلطنت کا بھی انتقال ہو گیا پیشوائی کی جگہ خالی ہو گئی تو عبداللہ قطب شاہ نے "بو سا طت والدہ .... شاہ محمد پیرزادہ بمنصب پیشوائی (بقاعدۂ تشریفات پیشوائی) نواب علامی شیخ محمد مرحمت نمودہ بعد از ین منصب وزیری از میر محمد رضای استرابادی گرفتہ بنواب علامی دادند (حدیقۃ السلاطین ۷۸ تا ۸۰)

شاہ محمد اپنی پیشوائی کے زمانے میں حکومت کا وفادار نہیں رہا۔ اس نے عادل شاہ سے سازباز شروع کر دی۔ خواجہ افضل بیگ ترکمان نے راستہ میں اس کے فرستادہ کو گرفتار کر کے کچھ خطوط پکڑ لیے اور بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے۔ اسی اثنا میں لشکر غنیم نے تارے

حوالہ ولد شاہ قاضی کا انتقال ہوگیا۔ علامہ ابن خاتون کو اس کے قلمدان میں سے ایک ایسا خط ملا جس کو شاہ محمد نے شاہ قاضی سے عادل شاہ کے نام لکھوایا تھا۔ علامہ نے اس خط کو بھی بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا۔ شاہ محمد غدار قرار دیا گیا اور ــــ " خاقاں زماں اورا از

منصب پیشوای معزول نمود و در نہم ماہ رمضان ۱۰۲۸ ہجری تشریف

منصب پیشوای کل بہ نواب علامی مرحمت فرمود (حدیقۃ العالم ورق ۲۷۲ ب)

اس مسرت میں نظام الدین صاحب حدیقۃ السلاطین نے جو علامہ کا دست گرفتہ بھی تھا، چھ شعر کا قطعہ تاریخ لکھا جس کا آخری شعر ہے ؎

"بالہام آمد این مصراع تاریخ — محمد یافت از حق پیشوای" ۱۰۲۸ ھ

عین اسی زمانہ میں (۱۰۲۸ھ) میں مغلیہ سلطنت کی جانب سے شیخ محی الدین بیان کا حاجب تھا۔ قطب شاہی حکومت کے ساتھ اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ وہ بے جا دباؤ ڈال کر حکومت قطب شاہیہ سے ناجایز فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

علامہ ابن خاتون مسند پیشوای پر قدم رکھتے ہی اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوئے اور مغلیہ سلطنت کے وزیر اعظم یمین السلطنت آصف خاں اور دوسرے امرا کو شیخ محی الدین کی حرکتوں سے واقف کرایا۔ یہ خبر شاہجہاں تک پہنچی۔ شہنشاہ نے حاجب کو تادیبی حکم بھیجا کہ: "شیخ محی الدین تخلف از رضاے خاطر ننمودہ۔ در جمیع امور متابعت نماید و صلاح و رضاے ایشاں را عین رضاے بادشاہی داند"۔ (حدیقۃ السلاطین ص ۸)

علامہ کے تعلقات آصف خاں کے گھرانے سے بہت گہرے تھے۔ علامہ نے دونوں حکومتوں کے تعلقات کو ہموار رکھنے کے لیے اس دوستی سے جایز فایدہ اٹھایا۔ اختر حسن کہتے ہیں کہ سرحدی علاقوں پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ علامہ نے آصف خاں سے خط و کتابت کی۔ شاہجہاں نے علامہ ہی کی سفارش پر یہ علاقے عبداللہ قطب شاہ کو واپس کر دیے۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۲)

۱۰۴۰ھ میں دکن میں سخت قحط پڑا۔ بارش بالکل نہیں ہوی۔ علامہ نے بادشاہ کی ایما سے شہر سے باہر نماز استسقا کا اہتمام فرمایا۔ ماثورہ دعائیں تلاوت کی گئیں۔ آپ نے غریبوں، مسکینوں اور مستحقوں میں بے دریغ روپیہ تقسیم فرمایا۔

عبداللہ قطب شاہ علامہ کی دیانت، وفاداری اور تدبر ملکی سے بحد مطمئن تھا۔ اس کے اظہار مسرت میں آپ کو لقمان الزمانی، پیشوای زمانی، نواب مستطاب کے خطابات سے نوازا۔

اندر دولت خانہ دوازدہ امام سے قدسی محل تک پالکی میں آنے کا اعزاز بخشا۔ یہ اعزاز صرف حضرت میر محمد مومنؒ کے لیے مخصوص تھا یا پیران کے شاگرد علامہ ابن خاتون کو بخشا گیا۔ ان بزرگوں سے پہلے کسی کو یہ اعزاز ملا نہ ان کے بعد کسی کو عطا ہوا۔

اس دنیائے شر و فساد میں آج بھی محبوب خلایق محسود زمانہ ہوتا ہے۔ اس افتاد سے علامہ کو بھی گذرنا پڑا۔ میر محمد رضائے استرابادی نے بادشاہ سے علامہ کی چغلی کھائی اور عبد اللہ قطب شاہ کے خوب کان بھر دیئے۔ بادشاہ کان کے کچے تو ہوتے ہی ہیں۔ عبد اللہ قطب شاہ میر محمد رضائے استرابادی کے فریب میں آ گیا۔ اس نے آپ کو پیشوائی کے منصب سے سبکدوش کر دیا اور جمادی الاول ۱۰۴۲ء سے ۸ رشوال ۱۰۴۲ء تک چھ مہینے کے لیے گھر بٹھا دیا۔ علامہ بھی بڑی بے نیازی کے ساتھ گھر بیٹھ گئے۔ اسی عرصہ میں عادل شاہ کی بڑی بہن سپہ سالار مربی کے ساتھ حیدرآباد آئی۔ مربی شہزادی کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں صورت حال معلوم ہوئی۔ اس نے حسن تدبیر سے بادشاہ کے سامنے چغلی اور سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ عبد اللہ قطب شاہ نے اس پیشوائی کے منصب کو علامہ کو گھر بٹھانے کے بعد میر محمد رضائی کے سپرد کر دیا تھا۔

میر محمد رضا کا مقصد ہی یہ تھا کہ اس عہدے پر خود آ جائے لیکن جب حقیقت ظاہر ہو گئی تو بادشاہ نے یہ عہدہ میر محمد رضا سے لے لیا اور اپنے کئے پر متاسف بھی ہوا۔ اس نے نہ صرف علامہ کے سارے اعزازات بحال کر دیئے اور پیشوائی کا منصب ان کے سپرد کر دیا بلکہ علامہ کی خدمت میں سونے کا پاندان روانہ کیا۔ اسی دن مسجد کو آراستہ کروایا۔ سارے امراء اپنی اپنی جگہوں پر ایستادہ تھے۔ بادشاہ نے اہل دربار کے سامنے علامہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور جلالۃ الملکی کا عہدہ بھی عطا فرمایا اور "جمیع مہام سلطنت

و عنان کل امور مملکت بقبضہ اقتدار و اختیارش سپردند — و نیز پالکی از طلا و نقرہ بجہت سواری نواب علامی مرحمت فرمودند" (حدیقۃ السلاطین ۱۵۰)

اسی سال علامہ کی توقیر میں اور بھی اضافہ ہوا۔ بادشاہ نے چودہ سلحہ داروں کے علاوہ مخدوم الملک اور سید بابو کو جو سو سواروں اور ہزار ہزار پیادوں کے سولو تھے حکم دیا کہ وہ ہر جمعرات کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ کے ہمراہ فاتحہ خوانی کے لیے مقبروں کو جایا کریں۔

علامہ کے میر جملگی پر فائز ہونے کے بعد آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا۔ آپ کو پیشوائی کی تنخواہ ماہانہ ایک ہزار ہون ملا کرتی تھی میر جملگی کے عہدے پر آنے کے بعد اس کی تنخواہ سالانہ دو لاکھ الگ ملنے لگی۔ اس زمانہ میں ۲ ہون آج کے ۹ روپیوں کے برابر ہوتے تھے۔

علامہ نے میر جملگی کے عہدے پر آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ تمام مجلسیوں، محل داروں، سلو داروں اور سراپردہ داروں کی تنخواہیں بڑھادیں اور جن ملازمان شاہی کی تنخواہیں سابقہ عہدے داروں نے باقی رکھی تھیں ان سب کی تنخواہیں دلوادیں۔ اسی زمانہ میں علامہ کو یہ اعزاز بھی ملا کہ بادشاہ کی والدہ حیات بخشی بیگم شاہی محل کی دوسری معزز خواتین کے ساتھ علامہ کے مکان پر ایک ایک ہفتہ مہمان رہتیں۔

علامہ نے حیدرآباد میں بڑی مصروف زندگی گذاری۔ علامہ کے رات اور دن کا ہر لمحہ کسی نہ کسی علمی مشغلے کے لئے مختص تھا۔ روزآنہ صبح کو درس و تدریس کا سلسلہ رہتا۔ علم معقول و منقول حدیث، فقہ، تفسیر، معانی و بیان، فلسفہ و منطق، ادب و ریاضی کا درس ہوتا۔ سرکاری مصروفیت کو ختم کرکے گھر لوٹتے تو شام کو اہل فضل و کمال کی محفل جمتی۔ متقدمین جیسے انوری، حکیم سنائی، مولانا روم وغیرہ کا کلام زیر بحث رہتا۔ ان کی شرحیں ہوتیں۔ نئے نئے نکات سامنے آتے۔

قطب شاہی دور میں ہفتہ واری تعطیل منگل کو ہوا کرتی تھی۔ علامہ ان تعطیلات میں دو ایک مرتبہ شہر کے باہر جشن کا اہتمام کرتے تھے۔ ان جشنوں میں بیرونی ممالک کے سفیروں کے علاوہ شہر کے معززین کو مدعو کرتے تھے۔

علامہ کو درس و تدریس سے فطری لگاؤ تھا۔ نہ صرف خود پڑھایا کرتے تھے بلکہ علم کو عام کرنے کی غرض سے مدرسوں کو قائم کرتے اور مدرسین کا تقرر فرماتے تھے۔ میر عالم لکھتے ہیں۔ "مدارس عالی بنا نمود و مدرسین در آں مقرر فرمودند۔" (حدیقۃ العالم ورق ۱۹۵ ل)

علامہ کی مصروف زندگی کو دیکھتے ہوئے سوچنا پڑتا ہے کہ علامہ تصنیف و تالیف کے لیے وقت کب نکالتے ہوں گے۔ گھر پر طرحی مشاعرے الگ منعقد کرتے تھے۔ آپ کو شعر و ادب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ خود بھی شعر کہتے تھے۔ عالی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا کلام فی الحال ہماری دسترس میں نہیں ہے لیکن نظام الدین نے جتنا کلام بھی اپنے حدیقہ میں محفوظ کیا ہے ان سے آپ کی قادرالکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ تبرکاً دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

سطری کہ در بیان رموز محبت است ۔۔۔ ہر نقطہ بہ عالم فلاطون برابر است

جعد ل ز خضر لیبلت بادۂ حیات گرفت ۔۔۔ شکستہ کشتیٔ ما ساحل نجات گرفت

اختر حسن نے مرزا محمد طاہر کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ نے ۱۰۵۸ھ میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۷) سید علی اصغر بلگرامی مآثر دکن میں صفحہ ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ۔ "پرانی حویلی کی دیوار کے اندر محاذی دیوڑھی قدیر جنگ بہادر میں آپ ...... آسودہ ہیں۔"

علامہ نے اپنے انتقال سے قبل اپنے اثاثہ کے بارے میں وصیت کردی تھی۔ اس کے مطابق مرزا اسد عریاں علامہ کا سارا اثاثہ ایران لے گیا اور دیانت داری کے ساتھ آپ کے وارثوں میں تقسیم کردیا۔ (قطب شاہی دور کا فارسی ادب ص ۱۸۷)

علامہ کا مزار ابھی پرانی حویلی کی دیوار میں ایک چوکھنڈی میں ہے جس پر برسہا برس سے ایک بیل سایہ کئے ہوئے ہے۔ یوں تو عوام فاتحہ خوانی اور منتیں مانگنے کے لیے روز آتے ہیں لیکن پنجشنبہ کو زیادہ ہجوم رہتا ہے۔ اس قلندر مزاج علامہ کے مزار پر نہ کوئی مجاور ہے اور نہ کوئی متولی۔ حال حال تک مزار راتوں کو بے چراغ رہتا تھا صرف جمعرات کو چند موم بتیاں جلتی نظر آتی ہیں۔ ابھی چند دنوں سے کسی نیک بخت نے ایک بلب لگا دیا ہے۔

علامہ نے اپنی یادگار میں چار گراں بہا کتابیں چھوڑی ہیں۔

۱۔ شرح اربعین۔ جس کے بارے میں علی بن طیفور نے لکھا ہے کہ "شرح اربعین خیلی معروف است۔"

۲۔ شرح ارشاد۔

۳۔ کتاب الامت۔

۴۔ جامع عباسی کی تکمیل۔ یہ کتاب دراصل علامہ کے ماموں اور استاد شیخ بہاؤ الدین آملی نے لکھنا شروع کی تھی۔ عمر نے وفا نہ کی اس لئے یہ کتاب نامکمل رہ گئی تھی۔ علامہ نے اس کے کئی باب لکھ کر تکمیل کی۔ اس کتاب کا موضوع فقہ ہے۔

جب تک یہ کتابیں ہیں علامہ کو علمی دنیا فراموش نہیں کرسکتی اور جب تک مرادیں برآتی رہیں گی عقیدت مند آپ کے مزار کا طواف کرتے رہیں گے۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ منعقدہ ۸۴ء کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

عزیز النساء صبا

حیدرآباد دکن

ضامن امن وامان، پیار، محبت کا نشاں
اس کی آغوش میں بستے ہیں فقط وہ انساں
ربطِ باہم کو سمجھتے ہیں جو اپنا ایماں
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

کبھی کرتے ہی نہیں ترکِ محبت ہم لوگ
چھوڑتے ہی نہیں دامانِ شرافت ہم لوگ
غمگساری کو سمجھتے ہیں عبادت ہم لوگ
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

اس میں ہندو بھی ہیں مسلم بھی ہیں عیسائی بھی
قوم کی سطح پر ان سب میں ہے یکتائی بھی
سب کے مذہب ہیں الگ اور ہیں سب بھائی بھی
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

جانِ تہذیب وادب، مرکزِ تعلیم وہنر
اتحاد ایسا ہے آپس میں کہ لگ جائے نظر
جگ میں ہے چاہتی مثال آپ صبا اپنا نگر
حیدرآباد دکن کیا ہے یہ ہم سے پوچھو
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ قلم سے پوچھو

نعیم احمد نعیم گلبرگوی

غزل

بدلتے موسموں سے بے خبر تھا
مرے آنگن میں جو اندھا شجر تھا
شفق کی آنکھ سے ٹپکا تھا آنسو
سوا نیزے پہ جب سورج کا سر تھا
ہمارے جسم کو بخشی ہے رونق
جو کیڑا لہلہاتی شاخ پر تھا
مداوا ڈھونڈنے اپنی انا کا!
کئی صدیوں سے گھائل تیشہ گر تھا
مرے احساس کا گھائل پرندہ!
گھنے جنگل میں خائف رات بھر تھا
نعیم اک پُرسکوں برگد کا سایہ
سلگتے جسم کی دیوار پر تھا

مہدی پرتاپگڈھی

غزل

ہمارے نام بھی اپنی عنایتیں لکھ دو
چلو یہی سہی دو چار تہمتیں لکھ دو
اس اعتماد پہ کچھ روز اور جی لیں گے
تم آنے والی سحر کی بشارتیں لکھ دو
گراں ہمیں پہ نہیں وقت کا لبِ اظہار
ہوئی ہیں زخمی [illegible] سماعتیں لکھ دو
نظر میں آئے نہ دیواروں کا برہنہ پن
یہاں پہ چند سنہری عبارتیں لکھ دو
مرے خلوص پہ انگلی اٹھانے والو سنو!
تم اپنی مصلحتوں کی بھی تہمتیں لکھ دو
مجھے تو مل نہ سکی التفات اپنوں کی
خراب کیسے ہوئیں اس کی عادتیں لکھ دو
مرا ضمیر مجھے سنگسار کرتا ہے
مرے فسانے میں ایسی صداقتیں لکھ دو

پرانی قدروں کے ملبے سے نکلوا کے مہدی
نئے نصاب میں زندہ روایتیں لکھ دو

محمد سلیم انصاری

۳ نظمیں

۱۔ (بے سر کا جسم)

وہ میری گردن پہ
اپنا چہرہ لگا کے خوش ہے
مگر اسے بھی
خبر نہیں ہے
کہ جب
رگوں سے رگیں نہ مل پائیں گی
تو کیسے
ان میں لہو بہے گا؟

۲۔ شکست

جگنوؤں کے قتل میں ناکام ہو کر
جب وہ اپنے ہاتھ میں
خنجر لیے لوٹا
تو اس کے گھر کے
سارے پھول زخمی ہو چکے تھے

۳۔ یہ کمرہ
میرا قاتل ہے
مجھے ہر روز مجھ سے چھین کر
خود قتل کرتا ہے مرا
اور پھر
میری ریزہ ریزہ لاش اٹھا کر
دریچوں اور دروازے سے
پھینک دیتا ہے
باہر

عبدالمتین نیاز

غزل

جب ہو نہیں بار لوگ تری رہگزر چلے
بے اعتباریوں نے کہا تھا کدھر چلے

دھرتی پہ تھے تو ہم کو اڑانوں سے خوف تھا
آئے ذرا ہوا کے مقابل تو پر چلے

سورج کا سامنا بھی ذرا کیجیے حضور
اب رات ختم ہونے کو آئی تو گھر چلے

گھر میں ہمارے ہے خس و خاشاک کا جمود
یہ دیکھ کر پھر آگ لگانے شرر چلے

منصف بھی کہہ رہے ہیں وہ خود کو رحیم بھی
تہمت جو اپنے ظلم کی لاشوں پہ دھر چلے

آنکھیں لہولہان لیے لوٹ آئیں گے
دنیا کی دید کے لیے اہلِ نظر چلے

یہ سانحہ بھی دیکھ لیا ہم نے اے نیاز
جینا جو چاہتے تھے وہی لوگ مر چلے

صغرا عالم (ایم اے)

فراموشی

اک چمن اور صبا ساتھ رہی
محبت یہ وفا ساتھ رہی
وقت کب کیسے کٹا یاد نہیں

سر بہ زانو ہے جہاں کس کیلئے
سر بہ سجدہ ہے زماں کس کیلئے
اک ترے دل کے سوا یاد نہیں

ہر طرف نور کا پہرا دیکھا
چار سو ایک ہی چہرا دیکھا
کون کتنا ہے برا یاد نہیں

اپنی منزل پہ بہاریں بھی رکیں
ایک اک موڑ پہ تقدیریں سجیں
کب اٹھا دستِ دعا یاد نہیں

رات خوابوں کی صداؤں میں کٹی
دن کے شعلوں نے تری بات کہی
کب ہوئی تجھ سے جدا یاد نہیں

تیری راہوں سے گزرتی ہی رہی
ٹوٹتی اور بکھرتی ہی رہی
عکس کب چور ہوا یاد نہیں

غزلیں

حشمت فاتحہ خوانی

خوابوں کا سلسلہ نہ خیالِ غبار اب
یعنی ہمارے بس میں کہاں انتشار اب

شہر ہے یا کہ کوئی آزمودہ خواب
تنہا لگے ہے بھیڑ میں اپنا شمار اب

تعبیر کیا بتائے گی نیندوں کی تشنگی
آموختہ پھر سے یاد کرو بار بار اب

ایسی ہی کوئی بات تھی دونوں کے درمیاں
لگتا تھا جیسے دو ہی رہے ہوشیار اب

حشمت پڑی ہے کس کو ضرورت کہ جانئے
کرتا ہے کون شہر میں اپنا شمار اب

ایمن جعفری

بات کس کی آگئی یہ بات میں
کھو گیا ہر شخص اپنی ذات میں

توڑنا پڑتا ہے پتھر کا جگر!
راحتیں ملتیں نہیں خیرات میں

وہ بھی تو انسان ہے میری طرح
فرق ہے پر اس کی میری بات میں

آفتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں
زندگی کے ٹوٹتے لمحات میں

وہ ملا تھا پچھلے چوراہے پہ کل!
سر تا پا بھیگا ہوا برسات میں

جانے کتنی راتوں سے گذرا ہوں میں
اس کی یادوں سے بھری اک رات میں

عشق ایمن اک سنہری عید ہے
ہاں مگر جب تک رہے اوقات میں

رئیس الدین رئیس

بدگماں ہو جاؤں خود سے ہی گماں ایسا نہ ہو
قدر اونچا ہو لیکن آسماں ایسا نہ ہو

طے سمندر کا سفر کر لوں گا جاں ایسا نہ ہو
سازشیں کر لے ہوا سے بادباں ایسا نہ ہو

جنگ چھڑ جائے عزیزوں میں سماں ایسا نہ ہو
اس کے ناوک و ہدف اس کی کماں ایسا نہ ہو

تلخیوں کو بھول کر ہنستا مرے ماضی کہیں
مسکرانے کا یہ منظر بھی خزاں ایسا نہ ہو

میں حقیقت سے تصور میں تو جا پہنچوں ضرور
اُف! یہاں جیسا اندھیرا ہے وہاں ایسا نہ ہو

موڑ تو ہر راہ پر آتے ہی رہتے ہیں رئیس
ہم جدا ہو جائیں اک دن میری جاں ایسا نہ ہو

غزلیں

س۔ یونس

وصل کی روشنی اب کہاں آنکھ میں ۔۔۔ شمعِ کشتہ کا سارا دھواں آنکھ میں
بے بسی عمر بھر اشک پیتی رہی ۔۔۔ بن گیا ایک گہرا کنواں آنکھ میں
جس کے نیچے کسی پل اماں ہے نہ خیر ۔۔۔ بھر لیا میں نے وہ آسماں آنکھ میں
آئینے میں ہوئیں جذب بینائیاں ۔۔۔ رہ گئیں چند پرچھائیاں آنکھ میں
میں تو خود اس میں چھپنے سے عریاں ہوا ۔۔۔ اب تجھے بھی چھپاؤں کہاں آنکھ میں

ساتھ لایا ہے موسم وہ برسات کا
بدلیاں جسم میں بجلیاں آنکھ میں

بدر جمیل

قاتل ہے کون، کون سزاوار دیکھنا
پھر غور سے نوشتۂ دیوار دیکھنا

دیوار، کبھی سایۂ دیوار دیکھنا
کیا لگ گیا ہے دل کو یہ آزار دیکھنا

سچ بولنے کا جیسے اسے خبط ہو گیا
اب کوئی دن اسے بھی سرِ دار دیکھنا

خوابوں کی چند شمعیں جلا لینا آس پاس
چہروں پہ جب بھی کرب کے آثار دیکھنا

دانشورانِ زیست کی عادت سی ہو گئی
اس پار رہ کے زیست کے اس پار دیکھنا

کر لیجئے پہلے ڈھنگ سے شیرازہ بندیاں
پھر ولولوں کی جراتِ اظہار دیکھنا

لفظوں کے پُراسرار [illegible]
فکر و نظر کے [illegible] دیکھنا

خود برتری کا رنگ کہیں خوش قامتی کا زعم
اس شہرِ بے چراغ کے اطوار دیکھنا

بیگ احساس

بے سورج آسمان

پھر کیا ہوا ؟

"آسمان پر لٹکا ہوا سورج زرد ہو کر اتنا نیچے جھک آیا کہ سمندر کے ہونٹ اسے چھونے لگے خوفناک سمندر نے سورج کی گردن میں اپنے دانت پیوست کر دیئے اور اسے بھنبھوڑنے لگا۔ سورج کے زخمی بدن سے سُرخ بوندیں ٹپک ٹپک کر لہروں میں جذب ہو رہی تھیں۔"

"ٹھہرو۔ تم مجھے اس علاقے کی تو نہیں لگتیں۔"

"ہاں آپ کا خیال صحیح ہے۔"

"پھر تم وہاں کیا کرنے گئی تھیں۔" "میں سورج کا وہ گرم گرم تازہ لہو اپنے بدن میں اتارنے کے لیے آئی تھی۔" "پھر کیا تم ایسا کرنے میں کامیاب ہو پائیں۔"

"نہیں کیونکہ سمندر سورج کا لہو اپنے چہرے پہ مل کر تانڈو ناچ رہا تھا۔ ہوائیں اس قدر تیز تھیں کہ مجھے خوف ہوا کہیں میرا لباس بدن کو چھوڑ کر پرندوں کی طرح فضا میں نہ اڑ جائے اور کو شاید میں بھی تھی جو شخصیت کی کھول سے نکل کر آزاد ہونا چاہتی تھی۔"

"تم کتنے قدم چل کر سمندر تک پہنچی تھیں ؟"

"مجھے اچھی طرح یاد ہے پورے چھتیس (36) قدم میں چلی تھی۔ ریت کے سینے پہ قدموں کے وہ نشان بہت واضح تھے۔ ممکن ہے اگر لہروں کو غصہ آ جاتا تو وہ نشان مٹ جاتے لیکن اس وقت سمندر شانت تھا۔"

"تمہارا آخری قدم کہاں تھا۔"

"وہیں۔ ان تک لہریں پہنچ کر ریت پہ ایک شفاف آئینہ بنا رہی تھیں۔ میں اس آئینے کے

کنارے کھڑی لہروں کی جادوگری دیکھنے لگی۔ شریر لہروں نے میرے پیروں میں گدگدی کرنا شروع کردیا اور وہ مجھے چھیڑنے کے لیے تلووں کے نیچے سے ریت کے ذرے کھینچ لیتیں۔ کبھی کبھی تو میرا توازن بگڑ جاتا۔ میں نے آئینے میں جھانکا تو میرے قدموں سے جڑی میری ہی طرح ایک عورت الٹی لٹکی ہوی تھی۔ نیچے آسمان تھا اور لہولہان سورج بھی۔۔!"

"تم شاید وہی کھیل دیکھنے آئی تھیں؟"

"جی نہیں جناب عالی، میں تو سورج کا لہو اپنے بدن میں اتارنے کے لیے گئی تھی لیکن اس کھیل میں گم ہوگئی۔ جب تلووں کی گدگدی سارے بدن میں دوڑنے لگی اور حلق تک پہنچ کر پیاس بن گئی تو حلق میں کانٹے اُگنے لگے۔ تب میں اس آئینہ پر چلتی ہوی سمندر تک پہنچ گئی۔ چلو میں پانی سمیٹا، سمندر کا پانی نہ نیلا تھا اور نہ سُرخی مائل، ایک بے رنگی تھی۔ پھر سمندر میں بہتا سورج کا وہ لہو کہاں گیا کیا خون بھی بے رنگ ہوتا ہے؟ میں سوچ رہی تھی۔ لہروں کی جادوگری نے شاید سورج کے لہو کا رنگ چھین لیا ہو۔ میں نے خود ہی جھک کر سمندر سے ہونٹ لگا دیئے۔ ایک لہر کسی خونخوار جانور کی طرح میری طرف غرّا کر بڑھی۔ میں پیاس کے کانٹے حلق میں سمیٹے گھبرا کر پیچھے ہٹی تو کسی کے ٹکرانے کا احساس ہوا۔"

"کون تھا؟"

"میرے قدموں سے جڑی عورت کے قریب نیم جواں سے سائے لہرا رہے تھے میں نے سوچا شاید وہ سمندر کے کنارے خالی سیپیاں چننے آتے ہوں گے۔"

"تو کیا وہ غوطہ خور تھے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔ لیکن جب میں نے ان کے ننھے ننھے تلووں پر نظر ڈالی تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ پہلی بار سمندر تک آئے ہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ ان کی آنکھیں ان کے وجود کی معصومیت کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔"

"کیا تھا ان آنکھوں میں؟"

"ان آنکھوں میں سورج کا لہو اتر آیا تھا، شاید اسی لیے وہ لہریں ..."

"تمہارا مطلب ہے اس لیے وہ لہریں بے رنگ ہوگئی تھیں۔"

"ہاں! اس لیے وہ لہریں بے رنگ ہوگئی تھیں۔ اب ان لہروں سے ہونٹ لگا کر سورج کا لہو چکھنا بے کار تھا۔ میں واپس پلٹی تو میرے قدموں کے وہ نشان غائب تھے۔"

"ارے"!

"ہاں ـــــ وہاں آڑی ترچھی لکیریں بکھری ہوئی تھیں"۔
حاکم نے بڑی سی کتاب میں کچھ لکھا۔

"ہاں تو پھر؟"

"مجھے بہت غصہ آیا۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے اس وحشیانہ حرکت کے بارے میں سوال کرتی وہ میری طرف بڑھنے لگے۔ ساحل سنسان تھا۔ لمبے لمبے سائے ریت میں دفن ہوگئے تھے۔ پرندے بھی اپنے ٹھکانوں کو پہنچ کر خاموش ہوگئے تھے۔ مجھے شبہ ہوا۔"

"کیسا شبہ؟"

"کہ یہ لڑکے وہی غوطہ زن تو نہیں جو سمندر کی تہہ سے ڈوبا ہوا سورج نکالنے کی کوشش کرتے ہیں"۔

"پھر"؟

"میں تیز تیز چلنے لگی۔ اب شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سمندر میں کود پڑے"۔

"تم گھبرا گئی ہوں گی"۔

"گھبراہٹ سے زیادہ مجھے غصہ تھا۔ جناب عالی! اگر میں خود دریا کی طرح روانی سے بہتی ہوتی تو ایسے کئی چکنے پتھر میری تہہ میں پڑے ہوتے "اس لیے میں نے سوچا ان کے گالوں پر اتنے تھپڑ لگاؤں کہ آنکھوں میں اترا سورج کا لہو گالوں سے بہہ نکلے"۔

"تو تم دریا کی طرح روانی سے کبھی نہیں بہی تھیں"

"وہ الگ کہانی ہے جناب عالی میں تو کب سے کائی بھری چٹان بن گئی ہوں"۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا؟"

"اس کے بعد میں اتنا تیز چلنے لگی کہ پنڈلیوں میں چھپا نسوں کا جال درد کرنے لگا۔ پھر میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ آسمان کا چہرہ تاریک ہوتا جارہا تھا۔ سمندر نے سورج کا بہت سا حصہ نگل لیا تھا۔ آسمان کے چہرے پر سورج کے زخموں کا درد صاف جھلک رہا تھا۔ ریت اپنے خوفناک پنجوں سے قدموں کی رفتار روک رہی تھی' میں اپنے قدم چھڑا کر بھاگتی رہی"۔

"تم تو صدیوں سے اسی طرح بھاگ رہی ہو۔ قدموں کی دھمک ـــــ اور یہ تعاقب تمہارے لیے کون سی نئی بات ہے؟"

"ہاں صدیوں سے یہ تعاقب جاری ہے لیکن اس مرتبہ تعاقب کرنے والے وہ نہیں تھے

جن کے قدموں کی دھمک سے زمین دہل اٹھتی تھی، بلکہ جو قدم میرے تعاقب میں تھے، ان کے نشانات تک ریت پر نہیں بن پا رہے تھے ۔ یہ کیسا شہر ہے آپ کا؟"

حاکم نے سر جھکالیا۔

" تو سنیے ۔ ہم دوڑتے رہے ۔ آخر کوئی کنارے پر کتنا دوڑے ۔ کسی نہ کسی سرے پر سمندر سامنے آکھڑا ہوتا ہے "

" اور شاید یہی ہوا "

" ہاں بے چاری زمین کیا کرے جس کے چاروں طرف سمندر ہے۔ میرے سینے میں سانسوں کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ آخر جب کنارہ ختم ہوگیا تو میں لڑکھڑا کر گر گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے سائے میرے وجود کو ڈھکنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں زور زور سے چیخنے لگی۔"

" کوئی آیا چیخیں سُن کر ؟ "

" کون آسکتا ہے ۔ میں خود ہی بھاگتے بھاگتے اتنی دور چلی آئی تھی کہ چیخیں ماحول میں تحلیل ہوجاتی تھیں کوئی ایسی چیز درمیان میں نہ تھی جس سے ٹکراکر یہ چیخیں بازگشت بن جاتیں۔ خود آسمان کرب میں مبتلا تھا۔ سورج اس کی گرفت سے نکلا جارہا تھا۔ سمندر کے اوپر سورج کا آخری سرا نظر آرہا تھا، باقی حصہ سمندر نے نگل لیا تھا۔"

" تب کیا ہوا "

" اچانک ہی وہ دونوں سمندر میں کود پڑے اور لہروں سے لڑتے ہوئے کائی بھری چٹان کی طرف بڑھنے لگے، وہ ہانپ رہے تھے۔ اتنی دیر تک دوڑتے رہنے کے بعد ان کے پیروں میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ سمندر میں تیر سکتے۔ وہ کچھ وقفہ کائی جمی چٹان پر سستا لینا چاہتے تھے، لیکن ان کے پیر نہیں جم پا رہے تھے، وہ بار بار پھسل کر گرتے اور پھر سے کوشش شروع کردیتے۔ اس کوشش میں چٹان سے ٹکراکر ان کے وجود زخمی ہوگئے۔

اسی چٹان کے نیچے سمندر نے سورج چھپا رکھا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح چٹان ہٹاکر اس سورج تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن اتنی بڑی چٹان کا ہٹانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس جدوجہد میں ان کے ناخن ٹوٹ گئے اور پھر وہ اتنی زور سے چٹان سے ٹکرائے کہ پھر نہ اٹھ سکے۔ لہروں نے انھیں ساحل پر پھینک دیا۔

سمندر کا مدوجزر کم ہونے لگا۔ لہریں پُرسکون تھیں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا کہ کیا ہوا۔ وہ سر جھکائے واپس لوٹ رہے تھے۔"

"تو تم بچ گئیں"

"ہاں بچ گئی۔ چند لمحے میں گم سم پڑی رہی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ــــ گلا پھاڑ کر گالیاں بکتی رہی۔"

"کیوں؟ جب کہ انہوں نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا تھا، تم نے گالیاں کیوں دیں؟"

"جناب عالی! لہروں کے مسلسل عمل سے جو کائی چٹان پر جمی تھی، اسے انہوں نے کھرچ دیا تھا۔ چٹان کے نیچے چھپے سورج کی تپش اسے جھلسا رہی تھی۔"

"اور وہ سورج جو چٹان کے نیچے چھپا تھا؟"

"وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ چٹان کے پرخچے اُڑ گئے۔ سمندر میں بھونچال آگیا ــــ کل جب زمین اپنا ایک چکر پورا کرے گی تو آسمان بے سورج ہو جائے گا۔"

"اس کے آگے کچھ مت کہو۔ مجھے معلوم ہے ..... آگ برسنے لگے گی یا پھر زمین سے سانپ اُبل پڑتے ہیں۔" حاکم نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

اس نے سر پر بڑی کتاب کا سائبان بنا لیا اور پیر زمین سے اٹھا لیے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے دیکھا حاکم کی کرسی خالی ہے وہ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہاں سے بھاگنے لگے۔ ٭

محمد قلی کی شاعری

(صفحہ ۱۷ سے آگے)

غرض محمد قلی کی شاعری میں قطب شاہی تہذیب ہی نہیں بلکہ اس عہد کے لوگوں کے جذبات اور تصورات صاف نظر آتے ہیں اور شاعر نے خارجی موضوعات میں داخلیت کے حسین امتزاج سے ایک پُرکیف سماں باندھ دیا ہے اور تمام ترقی بصیرت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی شاعری میں عوامی اور سماجی پہلو کا جس انداز سے ذکر ملتا ہے وہ اگلی نسلوں کے لئے رہنمائی کا باعث بنا اور صدیوں بعد اس طرح کی شاعری کو ہندوستان کے لئے ناگزیر سمجھا گیا جو یک جہتی اتحاد اور اخوت کی علمبردار ہو۔

(یوم محمد قلی کے ادبی اجلاس منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء میں پڑھا گیا)

نقد و نظر

تبصرہ کیلئے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

نام کتاب: پیاسی زمین صنف: مجموعہ غزلیات مصنف: ڈاکٹر نظیر صفی پوری
ضخامت: ۱۲۰ صفحات قیمت: بیس روپے ملنے کا پتہ: ۱۶۲/۲۲۵ محمود نگر، لکھنؤ ـــــــ ۳

اردو غزل میں بے انتہا کشش ہے اور کسی اور زبان میں غزل اتنی کامیاب اور تروتازہ نہیں، جتنی اُردو زبان میں ہے۔ ادوار کے بدلنے اور ہر نئی تقویم کے ساتھ کبھی کبھی جمود کا جو احساس ہوتا ہے وہ حیرت انگیز طور سے مضامین، لب ولہجہ اور طرزِ اظہار کے زاویوں کے بدلنے سے متحرک اور حیاتِ نو میں ڈھل جاتا ہے۔ نقاد چاہے کتنی بار دعوئے کے ساتھ اُردو غزل کے اختتام کا اعلان کرے یہ زندہ اور جمیل رہے گی۔ "پیاسی زمین" جناب نظیر صفی پوری کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے سے گذرتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اُردو کو چاؤ سے پڑھا ہے اور برتا ہے۔ نرم اور متوازن انداز میں زندگی کے شب و روز کی تلخیوں کو تبسم زیرلب کی طرح اٹھا کے شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے شعری اسلوب میں تصوف اور معاملہ بندی دونوں رجحانات کا بھی پرتو ملتا ہے۔ ایک اور بات جو ان کی غزلوں کو نرم و نازک کیفیت بخشتی ہے وہ ہے ترنم آمیز بحور اور سہل لب ولہجہ کا انتخاب۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ مجموعہ مخصوص اربابِ ادب میں مقبول ہوگا۔ جناب نظیر سے میری درخواست ہے کہ وہ مضامین میں وسعت اور عمق منتخب کریں۔

کتابت، گٹ اپ اور طباعت تینوں ہی اوسط سے بہتر ہیں۔ ان کی شاعری کے چند نمونے باذوق قارئین کی نذر ہیں ؎

پھر اندھیروں میں کچھ دیے چمکے — اک نیا راستہ دکھاتے ہوئے
کاغذی پھولوں سے اچھا تھا کہ اس گھر میں نظیر — تم نے گلدان کو کانٹوں سے سجایا ہوتا
جس جگہ پہ ہے وہ ہیں جاگتا رہے — دھرتی گذر رہی ہے خروش انقلاب سے
ہماری داستان غم میں اتنا تو اثر آیا — ہوئی وہ چشم نم لیکن بہت آہستہ آہستہ

آپ کہئے تو بیٹھوں آپ کہئے تو اٹھ جاؤں آپ کی یہ محفل ہے آپ کا اجارہ ہے

(اسلم عمادی)

نام کتاب: **وقت کا سورج** صنف: مجموعۂ کلام شاعر: **ساحر شیوی** ضخامت: ۱۲۰ صفحات
قیمت: ۲۵ روپے ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس / ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۲ - ۱۱۰۰۰۲

"وقت کا سورج" اچھی کتابت، عمدہ طباعت سے مزین ساحر شیوی کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے علاوہ اس کتاب میں ان کی منتخب رباعیات، قطعات اور متفرق اشعار بھی شامل ہیں۔ شاعر کی یہ دوسری شعری پیش کش ہے۔ منظومات مشتملہ کے مطالعے سے یہ کھلتا ہے کہ شاعر کا بنیادی رویہ ان اقدار اور مقاصد کو زندہ کرنے کا متمنی ہے جو زندگی کی بے ترتیب دوڑ میں کرب اور مجہول حقائق کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں تیکھے طنز اور چبھتے ہوئے نعروں کا استعمال کر کے شاعر نے خود تنقیدی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کی شاعری میں واحد متکلم کا استعمال بکثرت ہے حالانکہ یہ واحد متکلم نئی زندگی کا ایک عام شخص ہے ان کی شعری تخلیقات میں عام باتیں، عام علامات اور عام گفتگو کو پیچ دار بنا کر ندرت پیدا کی ہے۔ چند مقامات میں نثریت شدید ہوتی ہوئی بھی محسوس ہوگی۔

ایک نظم قارئین بھی پڑھیں۔

"جدید علاج"

آگ دریا میں لگا دو / مچھلیاں چڑھ جائیں گی پیڑوں پہ سب / پھر جلا دو آگ پیڑوں کے تلے / مچھلیاں بھنتی رہیں گی خود بخود / مچھلیوں پر ڈال دو تھوڑا نمک / اور تم کھاتے رہو / جام سونے کا منگا کر / ڈال دو اس میں اسمگلنگ کی شراب / جام ہو سونے کا تو احساس ہی رہتا نہیں / کیا خبر ہوگی کہ یہ مے ہے حرام / زندہ مچھلی جل کے بن جاتی ہے درد دل کا علاج / مے اسمگلنگ کی بھی ہے آبِ حیات / بھوک بھی مٹ جائے گی / پیاس بھی بجھ جائے گی / اس طرح ہوگا بدن سے خاتمہ امراض کا ●

(اسلم عمادی)

نام کتاب: **نوشگفتہ** (شاعری) نام مصنف: **اسحاق ملک** مجلد معہ گرد پوش صفحات: ۱۱۸
سن اشاعت: دسمبر ۱۹۸۲ء قیمت: دس روپے کتاب ملنے کا پتہ: ادبی مرکز، اعجاز پریس، چھتہ بازار حیدرآباد

زیر نظر مجموعے کا نام "نوشگفتہ" ہے۔ اس نام کی لطافت ان کے مندرجہ ذیل اشعار میں بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔ مثلاً خط خود ہی پڑھتے پڑھتے خدا ہو گئی۔ اسی طرح سے

کہیں افسانہ بیہودہ ہو پریشاں میں ہر غم کو چھپاتا جا رہا ہوں

سکوں مل گیا مجھ کو بحرِ الم میں ! تلاطم ہی خود نا خدا ہوگیا

یوں نام تو کہنے کو ہمارا ہے غزل میں بکھرا ہوا ہر رنگ تمہارا ہے غزل میں

خوشی مانگی تھی ہم نے دو گھڑی کی کرم تیرا کہ تونے غم دیا ہے

"نوشگفتہ" کی نظموں کے کچھ حصے معنوی حیثیت سے واقعی نوشگفتہ معلوم ہوتے ہیں اور باقی ناشگفتہ ۔ "آزادی اور اردو" ایک اچھی سی نظم ہے ۔

جناب اسحاق مالک کی یہ پہلی ادبی کاوش امید افزا ہے ۔ ان کے ذوقِ سلیم اور سلامتِ فکر سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ آئندہ ان کی شعری تخلیقات فنی اسقام اور زبان و بیان کی فروگزاشتوں سے پاک ہوکر منظرِ عام پر آئیں گی ۔ (ادیب حیدرآبادی)

نام کتاب : سخنِ نامی (انتخاب کلام) مرتبہ : وقار خلیل

فکر تونسوی نے شاعر کے بارے میں ایک لطیفہ "فکر نامہ" میں لکھا ہے کہ شاعر کو خدا کے حضور میں پیش کیا گیا ۔ خدا نے پوچھا ۔ "شاعر ! تم چونکہ ہمارے خاص آزاد منش بندے ہو اس لیے تم خود ہی بتاؤ کہ تم جنت میں رہنا پسند کروگے یا دوزخ میں ؟" شاعر نے کہا ۔ "جہاں سامعین کی تعداد زیادہ ہو ۔" چنانچہ خدا نے اُسے دوزخ میں بھیج دیا ۔

یہ محض لطیفہ ہے ۔ اس میں کام کی بات یہ ہے کہ شاعر عموماً اپنے سامعین کا متلاشی رہتا ہے لیکن ایسے شعرا کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جو شعر کہتے ہیں اور سنانے کا شوق نہیں رکھتے اور مشاعروں میں شاذونادر ہی اپنا کلام سناتے ہیں ۔

ابوالوقار شاہ محمد چندا حسینی کوہ سوار نامی نظامی شاہ پوری بھی ایسے ہی ایک شاعر تھے ۔ نامی نے شگفتہ اور ہمیشہ تروتازہ رہنے والی غزلیں کہی ہیں ۔ انہوں نے مرزا غالب، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی اور نواب میر عثمان علی خاں عثمان کے اشعار پر خمسے لکھے ہیں ۔ ملی اور قومی جذبے کے تحت پاکیزہ اور خیال انگیز نظمیں بھی کہی ہیں ۔ ان کے مجموعۂ کلام "سخنِ نامی" میں کلاسیکی رنگ کی کئی غزلیں ہیں جن میں نکھری ستھری زبان، جذبہ اور احساس کی شدت اور اسلوب کی دلکشی ہے ۔ وہ مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال اور سیماب اکبر آبادی کے رنگِ سخن سے متاثر اور حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے مرید اور خلیفہ تھے ۔ دکن کی سرزمین سے انھیں بیحد پیار تھا ۔

نامی ۱۲ / اکتوبر ۱۸۸۹ء میں کرناٹک کے تعلقہ شولاپور میں پیدا ہوئے ۔ انہوں نے رائچور اور گلبرگہ کے اسکولوں میں ایک ہردلعزیز اور لائقِ احترام استاد کی حیثیت سے کام کیا ۔ نامی کا کلام

حیدرآباد، دہلی، لاہور، امرتسر اور جالندھر کے معیاری اخباروں اور رسالوں مثلاً رہبرِ دکن، اتالیق (حیدرآباد) الکمال (دہلی) صوفی، مسلمان، القریش اور پیسہ اخبار میں شائع ہوا کرتا تھا۔ غزل کے علاوہ ناؔمی نے کئی دوسری اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور ان اصناف میں اپنی شعری صلاحیت کا لوہا منوالیا۔ انہوں نے بچوں اور نوجوانوں کے لیے بھی سبق آموز اور فکر انگیز نظمیں لکھی ہیں۔ ناؔمی نے حمد، نعت، قطعہ، رباعی اور واسوخت بھی لکھے۔ ان کا مجموعہ کلام پہلی بار ۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ پنجاب سے شائع ہوا تھا۔ ان کے کلام کا انتخاب "سخنِ نامی" کرناٹک اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے ناؔمی کے بڑے فرزند جناب وقار خلیل نے نومبر ۱۹۸۲ء میں حیدرآباد سے شائع کیا ہے۔ انتخاب و ترتیب سے ان کے حسنِ سلیقہ کا ثبوت ملتا ہے۔

۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس مجلد مجموعہ کلام کا تعارف ممتاز نقاد پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسم نے سپردِ قلم کیا ہے اور پیش لفظ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی نے تحریر فرمایا ہے پروفیسر مغنی تبسم نے 'سخنِ نامی' پر اپنے تاثرات پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نامی کا کلام پڑھیے تو شگفتگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

فاضل مرتب جناب وقار خلیل نے اس مجموعہ میں "خود نوشت" کے زیر عنوان مخطوطہ 'سرمایۂ حیاتِ نامی' سے چند اقتباسات بھی شامل کیے ہیں جن سے ناؔمی کی زندگی، شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اس قادر الکلام اور پرگو شاعر نے ۲۷ جولائی ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا

'سخنِ نامی' خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ اور نامی کے ایک بڑے فرزند عزیز الرحمٰن سائل کے سوانحی نوٹ اور "تفصیلات" کے زیر عنوان' دوسرے بڑے فرزند جناب وقار خلیل کی معلوماتی تحریر کے ساتھ اشاعت پذیر ہوئی ہے۔ جناب وقار خلیل نے 'سخنِ نامی' کا انتساب اپنی والدہ مرحومہ کے نام کیا ہے۔

مجموعہ کلام "سخنِ نامی" ایوانِ اردو پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد سے بادائی قیمت فی جلد دس روپے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

محمد منظور احمد

نام کتاب: مکاتیب نجم" مرتبہ: محمد ایوب واقف مجلد صفحات: ۱۰۴ ڈیمائی سائز سنہ اشاعت ندارد قیمت: ۲۰ روپے ناشر: منشی دیانرائن نگم میموریل ٹرسٹ چلبست روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

غالب، مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، صفیہ اختر اور فیض احمد فیض کے خطوط کے مجموعے دنیائے ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ مکاتیبی ادب کے اس تناظر میں محمد ایوب واقف کی کتاب "مکاتیب نگم" کی اہمیت و افادیت کا ادراک و احساس عصرِ جدید میں یوں روشن ہو جاتا ہے کہ یہ خطوط مشہور زمانہ ادبی رسالہ "زمانہ" کان پور کے ایڈیٹر روشن خیال، اردو محسن، منشی دیا نرائن نگم کے تحریر ہیں جن کا افق اردو کلچر، ادب اور ملی جلی ہندوستانی تہذیب کی صیانت و پاسداری کا وثیقہ ہیں۔ آنجہانی نگم نے ایک کم پچاس برس تک خلوص و توجہ سے "زمانہ" کی باقاعدہ معیاری اشاعت کا فرض نبھایا اور صدہا ہندو مسلم اہلِ قلم اصحاب کو زحمتِ قلم کی درخواست کر کے ان کی پیدا پنہاں صلاحیتوں کو دنیائے ادب سے روشناس کیا۔ پریم چند، چکبست، نوبت رائے نظر خالص "زمانہ" کی پیداوار ہیں جنھیں آج ہم اردو کا کلاسیکی ورثہ کہتے ہیں۔ "مکاتیبِ نگم" میں ۸۹ خطوط شامل ہیں۔

یہ سب خطوط محمد ایوب واقف نے بڑی محنت سے یکجا کیے ہیں۔ دیا نرائن نگم کے یہ خطوط "زمانہ" کی قلمی اعانت کے سلسلے میں اپنے مخصوص اور مخلصانہ اشنائیوں سے سپردِ قلم کئے ہیں جن میں احسن مارہروی، منور لکھنوی، مسعود حسین رضوی ادیب، جوش ملیح آبادی، ثاقب کانپوری، جگر بریلوی، محشر بدایونی اور حیدرآباد کے تمکین کاظمی اور سوریہ پرتاپ لال حق گو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ فاضل مرتب نے اپنے وقیع مقدمہ، حواشی اور متذکرہ مکتوب الیہم سے اس مجموعہ مکاتیب کی شان دوبالا کر دی ہے۔

"مقدمہ" میں جناب واقف نے بجا لکھا ہے کہ منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ" دونوں ہی اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں، دونوں کی عظمتیں بے پناہ ہیں۔ دونوں کی خدمتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہماری زبان ان دونوں کے احسانات تلے دبی رہے گی۔ آنجہانی نگم نے اردو کی خدمات کے سلسلے میں ایک مثالی زندگی بسر کی۔ اور اپنی بے پناہ اور عظیم قربانیوں سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو کے خلاف آوازیں کتنی ہی بلند اور شدید کیوں نہ ہوں، ان سے اردو کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، شرط یہ ہے کہ اردو کی خدمت کے لیے لگن سچی ہو، جذبہ پختہ ہو اور اردو کے لیے ایمان مکمل ہو۔ نگم ایسے محبِ وطن اردو دوستوں کے کارناموں کو نئی نسلوں سے متعارف کرانا وقت اور عصر کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس پس منظر میں "مکاتیبِ نگم" کا مطالعہ توجہ اور انہماک چاہتا ہے اور ایسی کتابوں کو عمومی طور پر خرید کر پڑھا جانا، اردو دنیا کے ہر فرد کا فرض بن جاتا ہے۔ (ذوالفقار خلیل)

APRIL 1984

R. N. 10922/57.
egd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 004. (A. P.)

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

سب رس



بیادِ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

جلد ۴۴ شمارہ ۹ سنِ اجرا ۱۹۳۹ء

فون: ۳۸۴۶۹

ستمبر ۱۹۸۴ء

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

مدیر اعزازی: پروفیسر مغنی تبسم

شریک مدیر: محمد منظور احمد

معاون مدیر: وقار خلیل

قیمت: ۲ روپے ۵۰ پیسے

زر سالانہ: ۳۰ روپے کتب خانوں سے ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری: ۴۵ روپے بیرونی ملکوں سے

ہوائی ڈاک سے	بحری ڈاک سے
مشرق وسطیٰ ۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ ۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون ۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان ۸ پونڈ	۲½ پونڈ

رمن راج سکسینہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل پرنٹنگ پریس، چادر گھاٹ میں چھپوا کر، حیدرآباد-۲۴ سے شائع کیا

کتابت: رضی الدین اقبال

خط و کتابت کا پتہ: ادارۂ ادبیاتِ اردو
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد 500482

سرورق: سلطان ابوالحسن قطب شاہ

ترتیب:

خادم رزمی

سلام

پہلے پہر کو مشکیزے میں پانی بھرنا ہے
پھر چھوٹے لشکر کے بیچوں بیچ گزرنا ہے
رات تلاطم خیز فضا اور ایک صدا کا نور
وہ رہ جائے جس کو موت کے گھاٹ اترنا ہے
اک جانب سایہ سبزہ ہے دو رُخ جس کا انت
دوجی سمت سلگتی ریت پہ کوثر جھرنا ہے
سورج اس دھرتی پر دھوپ بچھائے شال مثال
جس پر ایک گلاب بدن کو ابھی بکھرنا ہے

کیسی نوری سوچوں، سچے لہجوں والے ہیں
سچائی کے ساتھ ہی جن کا جینا، مرنا ہے

سلیمان اطہر جاوید

قلم کی کاشت*

ایک مطالعہ

محمد عثمان عارف نقشبندی، ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ایڈوکیٹ، سیاستداں، وزیر با تدبیر، صوفی منش اور شاعر ——— اہم بات یہ ہے کہ ان کی شخصیت کی یہ جہات ایک دوسرے کو متاثر کئے بغیر رفعتوں کی سمت رواں دواں ہیں۔ اس کے ساتھ یہ امر بھی لائقِ ذکر ہے کہ ان کے ایڈوکیٹ، سیاستداں، صوفی اور وزیر کے موقف نے ان کی شاعرانہ مرتبت میں اضافہ شاید ہی کیا ہو، ہاں ان کی شاعری نے ان کی ان حیثیتوں کو اور جلا بخشی ہے کچھ اور دلآویز اور محترم بنادیا ہے۔ اپنی دیگر مصروفیات اور معاملات سے وابستگی کے باوصف عثمان عارف اپنی شاعری پر اتنی ہی توجہ دیتے ہیں جیسے نہ ان کی اور کوئی مصروفیت ہے اور نہ وہ کسی اور معاملہ سے وابستہ! یہ کچھ ایسی تعجب خیز بات بھی نہیں۔ بیشتر زبانوں میں ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خود برصغیر میں امیر خسرو کا نام نمایاں اہمیت رکھتا ہے تو ادھر عصرِ حاضر میں حسرت موہانی، فیض، مخدوم، وجد اور قاضی سلیم کے اسمائے گرامی لائقِ ذکر ہیں۔

عثمان عارف نے اپنی شاعری پر توجہ دینے کے باوجود، اپنی دیگر مصروفیتوں کے سبب خصوصاً اپنے کلام کی اشاعت پر ایسی اور اس قدر توجہ نہیں دی۔ اس لئے بحیثیت شاعر کے انھیں وہ مقام نہیں مل سکا جس کا ان کی شاعری استحقاق رکھتی ہے۔ تاحال، ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "نذرِ وطن" (۱۹۷۶ء) "عقیدت کے پھول" (۱۹۸۱ء) "قلم

سیدکس حیدرآباد

ستمبر ۱۹۸۴ء

کاشت" اور" نمودِ زندگی" (۱۹۸۲ء) ———— یہ ایک قابلِ لحاظ سرمایہ ہے لیکن کسی نہ کسی وجہ سے تنقید نے ان کے بارے میں توجہ نہیں دی ———— " قلم کی کاشت" عثمان عارف کی غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں اردو غزل کے سارے روپ جلوہ گر ہیں۔!

عثمان عارف کی شاعری کی عمر اور ان کی دیگر مصروفیات خواہ کچھ ہوں لیکن ان کو ابتدا سے شاعرانہ ماحول ملا۔ عثمان عارف نے شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ ان کے والد الحاج مولانا محمد عبداللہ بیدل بیکانیری ایک نامور شاعر تھے۔ جن کا شمار حضرت بے خود دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا تھا۔ عثمان عارف کا رشتہ شوق قدوائی سے بھی ملتا ہے کہ کالج میں عثمان عارف کے استاد حکیم بادشاہ حسین رعنا لکھنوی تھے جو نبیرۂ شوق ہوتے ہیں۔ یوں عثمان عارف کا تعلق دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے ہوجاتا ہے اور ان دونوں دبستانوں کے بیشتر اوصاف حمیدہ سے ان کی شاعری مزین ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ عثمان عارف کی غزل میں اردو غزل کے سارے روپ جلوہ گر ہیں۔ میرے نزدیک یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ عثمان عارف نے جہاں غزل اور غزل کی روایات کا گہرا مطالعہ کیا اور ان سے اخذ و اکتساب کیا ہے، عصری زندگی اور اس کے مسائل اور تقاضوں پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ زندگی کو انھوں نے ہر زاویئے اور ہر جہت سے دیکھا ہے' محسوس کیا ہے' برتا ہے اور یہ ساری جھلکیاں ان کی غزل میں مل جاتی ہیں۔ " قلم کی کاشت" میں عثمان عارف کی صرف غزلیں شامل ہیں اور اس کاشت کی آبیاری' کوئی شبہ نہیں' انھوں نے اپنے خونِ جگر سے کی ہے۔ میں یہاں سب سے پہلے " قلم کی کاشت" سے چند ایسے اشعار پیش کروں گا جو غزل کے ایسے روایتی رنگ کے حامل ہیں جس سے غزل' کچھ ایسی نیک نام نہیں۔ عثمان عارف نے یہ اور بات ہے اس رنگ میں اپنے آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ یہ شعر ہے

کہاں غموں کی کڑی دھوپ میں قیام کریں
تمہاری زلفوں کا سایہ ملے تو شام کریں

پیرِ ہن سے ہو رہا ہے اس طرح بار شباب
جس طرح شیشے سے لبالب جام چھلکا جائے ہے

پھولوں سے بھی نازک ہے وہ شبنم سے خنک تر
جو شعلہ بدن و شعلہ رخ و شعلہ جبیں ہے

گرانا بجلیاں پردہ اٹھا کر
کرم یہ بھی ستم سے کم نہیں ہے

چمن میں لالہ و گل سے جو ہمکلام ہوا
تو یاد آ گئی تیری ادا ادا مجھ کو

بہ پیار خود آتا ہے آئینہ میں اپنے حسن پر
اب تو وہ اپنی ادا پر خود ہی شرما جائے ہے

ان اشعار کے موضوعات روایتی ہیں اور اسلوب بھی! عثمان عارف نے یوں روایتی غزل کے رنگ و آہنگ دونوں کے جمال کو بہ تمام و کمال برقرار رکھا ہے لیکن ان ہی حسن و عشق کے موضوعات پر ان کے اشعار غیر معمولی طرحداری کے حامل ہیں۔ خارجیت سے دور، روایتی انداز سے ہٹ کر، بڑے ہی نکھرے ستھرے، مہکتے مہکاتے، دلوں کو چھوتے ؎

یہ ہے خلوص ترکِ تعلق کے باوجود ۔۔۔ آنسو نکل پڑے جو کبھی سامنا ہوا

محبت خود بخود ہے ایک عالم ۔۔۔ شریک اس میں کوئی عالم نہیں ہے

اک ہوس سی دل میں ہے تو آنکھوں میں ہیں آنسو ۔۔۔ اس محفل سے ویراں سے وہ گذرا سا لگے ہے

نرم خو، شیریں سخن، نازک بدن، رنگیں لباس ۔۔۔ اب کوئی ایسا نظر آیا تو کہتا ڈر لگے

تصوف، اردو غزل اور خاص طور پر روایتی غزل سے ملزوم نہ سہی تاہم ان دونوں کا باہمی رشتہ گہرا اور مضبوط ہے۔ آج عوام کا مزاج اور ماحول بھی تصوف کا کہاں؟ بنیادی وجہ یہ بھی ہے عثمان عارف نسبتِ طریقت، نقشبندی رکھتے ہیں اور بقول خود صوفی بھی ہیں۔ اس طرح ان کی غزلوں میں تصوف کی کارفرمائی تعجب کی بات نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہاں تصوف کا رنگ گہرا سہی، گیرائی کا حامل نہیں ہے۔ ان کے ہاں تصوف کے موضوعات اور مسائل کے حامل اشعار کچھ ایسی زیادہ تعداد میں نہیں ملتے۔ کم از کم زیرِ نظر شعری مجموعہ "قلم کی کاشت" میں اس نوع کے اشعار کی تعداد کم ہے۔ میں چند اشعار درج کرتا ہوں ؎

کوئی رہبر نہیں دیکھا نہ کوئی ہمسفر جانا
وہ جس نے شمع دل کو ہی چراغِ رہگذر جانا

نور ہی نور ہے نقشہ کہاں، تحریر کہاں
آئینہ خانہ میں دیکھیں تری تصویر کہاں

کس کی عظمت کا ہے مظہر یہ جہانِ رنگ و بو
دیکھنا عارف، نگاہِ معتبر سے دیکھنا

البتہ نقشبندی گھرانے سے وابستگی اور صوفیانہ رجحانات سے عثمان عارف نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اپنے ایک اور مجموعۂ کلام "نورِ زندگی" میں "حالاتِ مصنف" کے تحت انہوں نے لکھا ہے: "صلح کل میرا مشرب، خدمتِ خلق نصب العین زندگی اور انسانیت میرا دین و ایمان ہے، یہی بہت بڑا فلسفہ ہے، بہت بڑا دین ہے۔ اسی وسیع النظری اور وسیع القلبی

نے انھیں زندگی کے ہر شعبہ میں سرخرو اور سرفراز کیا ہے۔ ان کی انسان دوستی کو اور علم اور ان کے اخوت اور بھائی چارگی کے جذبات کو اور نکھار اور سنوار دیا ہے اور یوں ان کو احساس کی وہ دولت بیدار حاصل ہوئی ہے جو بہت کم کے حصے میں آتی ہے۔ شاعر کے جذبات کس قدر نازک ہیں وہ غیر معمولی حد تک کس قدر حساس ہے، اس کا اظہار تو غزلوں کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ یہاں عمومی نوعیت کے دو، تین شعر پیش ہیں ؎

یہ کیا دستور ہے عارف، یہ کیا آئین دنیا کا
تہی دامن کوئی رہنا کوئی پھولوں سے بھر جانا

موت پر آہیں بھریں، ماتم کریں، آنسو بہیں
زندگی وہ سانحہ جس کا کہیں رونا نہیں

وہ جسم ہوں جو چوٹ سے شیشے کی نہ ٹوٹے
جو پھول کے لگنے سے ہو زخمی وہ بدن ہوں

ایسا بدن جو پھول کے لگنے سے زخمی ہو وہ کہاں تک سلامت رہ سکتا ہے، ٹوٹ ٹوٹ جائے، ریزہ ریزہ بھی ہو جائے تو کم ہے۔ یہ انتشار و اختلال، یہ اخلاقی قدروں کا زوال، تہذیب کا ماتم، عظیم روایات کا مرثیہ، کون کب تک دیکھتا اور پڑھتا رہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، یہ بہیمیت، انسان کے ہاتھوں انسان کا قتل، یہ شب و روز کوئی کب تک گزارے، کب تک خون کے آنسو روتا رہے مخفی مباد کہ عثمان عارف نہ صرف برسر اقتدار جماعت کانگریس آئی کے ایک اہم رکن ہیں بلکہ ایک اہم وزیر بھی۔ بعض عوامی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری حکومت ہمیشہ حزب اختلاف کے سر تھوپتی ہے، یہ درست نہیں، حکومت کو بھی اپنی ذمہ داری قبول کرنی چاہیئے۔ عثمان عارف نے حکومت سے اپنی قدیم وارانہ وابستگی کے باوجود، فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں بڑا غیر ذمہ دارانہ اور دو ٹوک موقف اختیار کیا ہے۔ یہ جرأت مندی کا ثبوت ہے۔ وہ یہاں کچھ نہیں رہ جاتے، نہ سیاستداں نہ وزیر، نہ کچھ نہ کچھ، صرف اور صرف ایک انسان! واقعہ یہ ہے کہ عثمان عارف سیاست پر اخلاقی قدروں کی بالادستی کے قائل ہیں۔ اپنے سیاسی موقف کو انہوں نے کئی جگہوں پر واضح کیا ہے، اپنے شعری مجموعہ "نور زندگی" میں انہوں نے اس سیاست کی تائید کی ہے "جس کا نام حکمت ہے جو انسانیت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے خلاف نہ ہو" اور اب یہ اشعار پڑھیئے جو صرف ایک انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار ہیں ؎

کیسے معلوم تھا بن جائے گا سب شہر ہی مقتل

پہلے خواہش تھی کہ با ہر کوچۂ قاتل سے نکلے ہیں

ایک دیوانے کو سمجھا نہ سکے فرزانے

شہر کی سڑکوں پہ یہ خون اُچھلتا کیوں ہے

انسان ہیں کہ شہروں میں خونخوار درندے

معلوم نہیں ہوتا جنگل ہے کہ بستی ہے

اک خون کا سیلاب ہے اک آگ کا دریا

جو امن کی دھرتی تھی وہ مقتل کی زمیں ہے

غنچہ و گل کیا کہیں گے وہ تو شعلہ بن گئے

حالتِ گلزار میرے جلتے گھر سے دیکھنا

پر کیسے سہمے سہمے دم بخود ہو پنچھیو

پاس کے جلتے مکاں سے شعلہ کیا آ کر لگا

صرف فرقہ وارانہ فسادات ہی کیا؟ زندگی اور زمانے کے دیگر واقعات، پیچ و خم، نشیب و فراز اور سیاہ و سپید کا بھی عثمان عارف نے بنظرِ غائر جائزہ لیا ہے۔ عصرِ حاضر کے اخلاقی زوال، مفاداتِ حاصلہ کی کشمکش، مادہ پرستی، کساد بازاری، دولت کی نامنصفانہ تقسیم، مجرمانہ ذہنیت، ماحول کی تہی مائیگی، کھوکھلے پن، معاشرتی اختلال، سیاسی انتشار، غرض یہ اور ایسی کئی چیزوں کا وہ کما حقہٗ احساس رکھتے ہیں ان کا نقطۂ نظر انسانیت دوست اور زندگی پرکشش ہے۔ اپنی صوفی منشی اور جرأت و بے باکی کے باعث وہ اظہار بھی کسی رو رعایت کے بغیر کرتے ہیں۔ مزاج میں دردمندی ہے اس لئے بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ غرض اس عصری حسیت سے ان کے کلام میں ایک اپنائیت اور یگانگت کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے انہوں نے اپنے اطراف و ماحول اور "آج" سے پیار کرنا سیکھا ہے وہ فرسودہ روایات اور ناکارہ رفتہ رسم و رواج سے دامن بچا کر ایک نئی صبح کے منتظر ہیں ـــ جانے دو ذہنیت مسموم کی جولانیاں جائے

زندگی ایک نئی صبح میں ڈھالی جائے

کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں!

کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

یہ اور ایسے کئی اشعار، جو شاعر کی عصری حسیت کی دستاویز ہیں، جیسے اشعار نہیں مرقعے ہیں، عصری زندگی کے مختلف رُخوں کے، مختلف پہلوؤں کے ۔

وہ خوف، وہ ہراس ہے، پتھرائے ہیں لوگ
پوچھیں جو حال ظلم کسی سے کہا نہ جائے

آسائشِ حیات کے سامان کے باوجود
کاندھوں پہ زندگی کا جنازہ دکھائی دے

کیسی وفا، کہاں کی محبت، خلوص کیا !
چھوڑو گزر گیا وہ زمانہ گزر گیا

ساحل کہاں ہے امن کا طوفانِ زندگی
انسان آج قلزمِ خوں میں اتر گیا

بہت اداس، بہت مضمحل، بہت غمگیں !
یہ زندگی ہے اسے نذر کس کے نام کریں

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

سونا حرام، شام و سحر جاگتے رہو
انسانیت کا غم ہے اگر جاگتے رہو

اور پھر اس غزل کے بیشتر اشعار کئی مسائلِ حاضرہ کو اپنے میں سمیٹے۔ شاعری کی عصری حسیت کی جامع اور وقیع تصویریں ہیں۔ میں چند شعر درج کرتا ہوں ۔

مجھے تم اپنی بابت جو بھی کہہ دو مان لیتا ہوں
یہ دنیا تو تمہاری داستاں کچھ اور کہتی ہے

تمہیں دھوکے میں رکھتا ہے تبسم لالہ و گل کا
مجھے حالات، برقِ آشیاں کچھ اور کہتی ہے

بہت ممکن امیرِ کارواں کی کوئی منزل ہو
مگر رفتارِ اہلِ کارواں کچھ اور کہتی ہے

بہاروں کی تعریفوں کے کل جو گیت گاتی تھی

وہی آواز حال گلستاں کچھ اور کہتی ہے

اجازت دی ہمیں تحریر کی تقدیر کی تم نے

مگر آوازِ سازِ ترجماں کچھ اور کہتی ہے

خصوصاً آخری تین اشعار میں جو طنز اور امرِ واقع کا اظہار ہے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت مشکل سے یقین آتا ہے (بلکہ نہیں) کہ یہ اشعار برسرِ اقتدار جماعت کے ایک ذمہ دار رکن کے ہیں (عموماً ایسے اشعار تو ہمارے ہاں بائیں بازو کے رجحانات کے حامل شاعروں کے ہوتے ہیں) عثمان عارف نے گویا یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانیت اور انسان دوستی اور اخلاقی قدروں کا احترام سیاسی اور نظریاتی وابستگی سے بالاتر ہے۔ اگر انسان کے دل میں خلوص اور دردمندی ہے اور وہ انسان کو انسان سمجھتا ہے تو سب سے پہلے وہ انسان کے دکھ پر رو دے گا، اس کی خوشی پر مسکرائے گا، خواہ وہ انسان اپنا ہو یا پرایا ____________

یہی انسان دوستی، دردمندی، اخلاص، پیار اور اپنائیت کے جذبات عثمان عارف کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی ہیں۔ ان سے ان کے کلام میں ایک ایسی دلنوازی اور دلکشی پائی جاتی ہے کہ غزل اور نکھر جاتی ہے۔ یہ اشعار آسانی سے نہیں بھلائے جاسکتے ؎

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں

ہم جس سے ملے، جی سے ملے، دل سے ملے ہیں

اس دورِ خود پرست میں دیکھا جو غور سے

عارف، خدا پرست ملے، انسان کم ملے

ہونے کو تو اس دور میں کیا چیز نہیں ہے

انسان کو ڈھونڈا یہاں، انساں بھی کہیں ہے

سپردِ مرگ کیا، کیسی بے وفا نکلی !

تمام زندگی جس زندگی کے ساتھ چلے

تغزل، غزل کا وصفِ خاص ہے۔ یہ کہنا لایعنی ہے کہ تغزل الفاظ کی رنگینی، مرصع کاری، اور تشبیہات و استعارات کی دلآویزی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن تغزل کے لئے دراصل خیال کی رنگینی اور دلآویزی اولین شرط ہے۔ مشاہدہ کی گہرائی، احساس کی شدت، اظہار کی بے ساختگی اور خیال و اظہار میں ہم آہنگی بھی ____________ بطور مثال ایسے بے شمار اشعا

پیش کئے جا سکتے ہیں کہ سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ کے باوجود فکر و خیال کی چاشنی و سرشاری سے وہ ہمارے ادبی سرمایے کا گراں بہا حصہ بن گئے ہیں۔ تغزل کے لئے موضوع کی بھی کوئی قید نہیں۔ یہاں مختلف موضوعات کے حامل ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں الفاظ کی رنگینی اور چکاچوند کی کیفیت ہو یا نہ ہو، تغزل کے اچھے نمونے ہیں ؎

وقت بھی کیسا مسعود ہے تری یاد کے ساتھ
کتنی تصویریں بناتا ہے، مٹا دیتا ہے

نقاب چہرے سے کس نے اٹھائی پچھلی رات
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں، چاند مدھم ہے

اخلاص و محبت کے حسیں پھول کھلے ہیں
ہم جس سے ملے، جی سے ملے، دل سے ملے ہیں

جنونِ عشق میں منزل کو جا لیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

اب یہاں ایسے بھی اشعار پیش کروں گا جن سے ظاہر ہوگا کہ کوئی فنکار اپنے زمانے کی رو اور رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ رو اور رجحانات اچھے ہوں کہ برے، خوب ہوں کہ خراب، شستہ ہوں کہ شکستہ، بہرکیف اپنی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں مجھے جدید شاعری کے معائب اور محاسن کے بارے میں کچھ عرض کرنا نہیں ہے اس لئے کہ ہر دور کی شاعری معائب کی بھی حامل ہوتی ہے اور محاسن کی بھی۔ کم یا زیادہ کا یہ اور بات ہے۔ عثمان عارف اپنے مزاج کے اعتبار سے اگرچہ اردو شاعری کی کلاسیکل روایات سے قریب ہیں لیکن غزل کے جدید رجحانات کی کارفرمائی بھی ان کے ہاں ملتی ہے اولاً وہ اشعار جن سے جدید شاعری کی طرحداری اور بانکپن کا اظہار ہوتا ہے ؎

کیسے بوسیدہ روایات کو قائم رکھیں
کس سے گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے

وہ خوف وہ ہراس ہے پتھر بنے ہیں لوگ
پوچھیں جو حالِ ظلم، کسی سے کہا نہ جائے

قیمت ہو کم و بیش تو یہ بات جدا ہے
بازار میں دنیا کے ہر اک شخص بکا ہے

زخم دھرتی کے ہیں کتنے ان گنت
شہر کی سڑکوں پہ کچھ دیکھا بھی ہے

اچھے اچھے چہروں سے ڈر ہے وقت کے ہاتھوں میں آئینہ بھی ہے

لیکن اس کے ساتھ ایسے اشعار بھی ہیں جو مجموعی طور پر عثمان عارف کے مزاج سے ہم آہنگ تو نہیں، بس لگتا ہے جدید شاعری کی رو نے انھیں متاثر کردیا اور یہ اشعار آپ ہی آپ ہوگئے ان اشعار کی تعداد "قلم کی کاشت" میں زیادہ نہیں، تاہم چند ایک ضرور ملتے ہیں۔ یہ دو ایک سے

بھڑکی ہوئی ہے آگ مچھیرے کے پیٹ میں مچھلی کے حلق میں ہے جو کانٹا لگا ہوا

'ابراے' میں جو ساتھ حسینہ تھی کل ترے ہنستی تھی آج "تاج" میں اک نوجوان سے

گاؤں کی گوری کہاں، گھونگھٹ کہاں سامنے نہریں بھی ہیں دریا بھی ہے

مجموعی طور پر "قلم کی کاشت" اردو شاعری میں ایک اچھا مطالعہ ہے۔ عثمان عارف نے زندگی کا گہرائی اور گیرائی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ احساس کی ندرت، جذبات کی شدت، مشاہدے کی گہرائی، اظہار کی کلرفگی کے باعث ان کے کلام میں خاصی دیدہ زیبی اور لالہ کاری ہے۔ انہوں نے بلاشبہ ماحول کی تہی مائیگی، اخلاقی بحران، اور معاشرتی زوال پر آنسو بہائے ہیں لیکن وہ انسان اور انسانیت سے مایوس نہیں۔ یہی رجائیت شاعر کا بہت بڑا سہارا ہے۔ رجائیت کے حامل کئی اشعار ان کے مزاج کے اس رُخ کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ اسی رجائیت کے باعث کہا جا سکتا ہے کہ عثمان عارف کی شاعری آج کی نہیں، کل کی شاعری ہے۔ زندگی کی اثباتی قدروں، امید، ایقان، اعتماد اور اعتبار کی شاعری ———— اور آخر میں بس ایسے چند اشعار سے

ڈوبنے والے سے طوفاں کی حقیقت مت پوچھ
ڈوبنے والا ہی ساحل کا پتہ دیتا ہے

اک صبح نو کی شوخ کرن کی امید میں !
رکھتا ہوں ذہن و دل کا دریچہ کھلا ہوا

مجبوریوں کو ان کی بھی رکھو خیال میں
آئیں گے وہ ضرور، مگر جاگتے رہو

جنونِ عشق میں منزل کو جالیا ہم نے
بھٹک کے رہ گئے جو آگہی کے ساتھ چلے

منزل ہمارے اپنے ارادوں کے ساتھ ہے
رہبر ملے نہ اب کوئی نقشِ قدم ملے

رفعت النساء بیگم

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

کرشن چندر عصر حاضر میں اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے۔ شگفتہ، پرکیف اور بے ساختہ اسلوب، ہلکی ہلکی غنائیت، طنز و مزاح کی پرلطف چاشنی اور فطرت کے حسن کو لے کر کرشن چندر نے نئے نئے افسانوں کے تانے بانے بُنے ہیں۔ ان کے موضوعات عام طور پر رومانی ہوتے ہیں لیکن ان رومانی موضوعات کو انہوں نے کچھ ایسے رنگ و آہنگ سے پیش کیا ہے کہ زندگی کی بڑی بڑی حقیقتیں ان کے دائرے میں سمٹ آتی ہیں۔ یوں تو ہر فنکار جذباتی اور حساس ہوتا ہے لیکن کرشن چندر میں یہ کیفیات کچھ اور زیادہ تھیں اور پھر زبان و بیان پر انھیں کچھ ایسی قدرت حاصل تھی کہ انھوں نے مبہم جذبات اور انجانے احساسات کو لفظوں کا پیکر دے کر ان کی تقدیر ہی بدل دی۔ اگرچہ کرشن چندر کی ہر کہانی پر رومانیت کی چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے لیکن خاص طور پر ان کے ابتدائی دور کی کہانیاں پورے طور پر رومانی ہیں۔ کشمیر کی حسین اور دلکش سرزمین، گلپوش اور گلنار وادیاں، جھل جھل کرتی شوخ اور چنچل ندیاں، چاندنی لٹاتے آبشار، برفانی کہسار اور دھڑکتے ہوئے دل اور ان دھڑکتے ہوئے دلوں کی صحبتیں ــــــــــ اس ماحول سے اپنے افسانوں کا مواد لے کر کرشن چندر نے کیا کچھ قیامتیں نہیں ڈھائی ہیں کچھ نہ پوچھئے ــــــــــ

یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ کرشن چندر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذارا۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے حسن کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جاسکتا ہے لیکن اسی کے ساتھ کشمیر کی زندگی کا دوسرا پہلو اس کی بدصورتی ان کے افسانوں میں معنی خیزی کے ساتھ ابھر آتی ہے۔ یہ بدصورتی جاگیردارانہ ماحول اور اس کی غلاظتوں، سفاکیوں، ظالمانہ اذیت کوشیوں اور کشمیری عوام کی غربت اور زندگی کے لئے صبر آزما

جد و جہد سے متعلق ہے۔ یوں تو حسن اور بدصورتی دونوں پہلوؤں کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے کرشن چندر نے کشمیر کی زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ رومانی ہوتے ہوئے بھی حقیقت کے ایک رُخ کو پیش کرتی ہے۔ حسن اور بدصورتی کا یہی متوازن امتزاج تاثر کی شدت کو تیز کر دیتا ہے اور یہی چیز ان کی ہمہ گیر اور وسیع مقبولیت کا باعث بھی ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "طلسم خیال" ہے۔ اس مجموعے کے افسانے اس وقت لکھے گئے جب کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب پر چھائی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ "طلسم خیال" کے افسانوں پر رومانیت کی چھاپ گہری ہے یہ رومانیت محض لفاظی، زندگی سے فرار اور تخیل پرستی ہی سے عبارت نہیں بلکہ کرشن چندر نے طرحداری سے کام لیتے ہوئے اس میں علم و ادراک اور آگہی اور تجربات اور زندگی کی سنگین حقیقتوں سے ٹکرانے کے عزم کی آمیزش بھی کر دی ہے۔ ان کی رومانیت محض لذت پرستی نہیں، ریاکاری سے نفرت، بناوٹ سے بیزاری کا احساس دلاتی اور صاف ستھرے معاشرے کی تشکیل پر آمادہ کرتی اور معصومیت اور مظلومیت سے پیار کے آداب بھی سکھاتی ہے۔ "طلسم خیال" کے افسانوں کی ایک اور خصوصیت ان کی منظر نگاری ہے۔ قاری کشمیر نہ بھی گیا ہو، کرشن چندر کے افسانے پڑھتے ہوئے کشمیر کی سیر کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کشمیر کے ایک ایک منظر، ایک ایک باغ، ایک ایک روش، ایک ایک پھول، ایک ایک پھل، وادیوں کے حسن، کہساروں کے نکھار اور جوانیوں کی شادابیوں کو وہ اپنے افسانوں میں متحرک اور چلتے پھرتے پیش کر دیتے ہیں۔

کرشن چندر کے افسانوں کے مجموعے "نظارے" کا رنگ رُخ بدل جاتا ہے۔ یہاں رومانیت کی لے مدھم اور حقیقت بینی اور سماجی شعور سے ہم آہنگ محسوس ہوتی ہے گویا رومانیت اور حقیقت ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتے ہیں۔ فنکار اب صرف رنگین وادیوں کی سیر نہیں کرتا بلکہ تلخ حقائق کو بھی دیکھتا اور اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے۔ "نظارے" کے افسانوں میں وادیاں اور آبشار بھی ہیں مگر ان پر پولیس کا پہرہ بھی، مدہوش کن حسن رکھنے والی کشمیری لڑکیاں بھی ہیں، لیکن یہ لڑکیاں جاگیرداروں کے شراب کے برتن بھی صاف کر رہی ہیں اس طرح وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو، متضاد پہلوؤں کو اپنے افسانوں کے کینوس میں سمیٹ لیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا معرکہ آرا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی سڑک کی کہانی ہے، جس میں نہ کوئی موڑ ہے اور نہ پیچ و خم، جو سیدھی چلی گئی ہے جس میں زندگی کے بھیانک گڑھے منہ پھاڑے

کھوٹے میں بے شمار اور متضاد واقعات پر مشتمل یہ افسانہ مجموعی طور پر کامیاب تاثر کا حامل ہے۔

کرشن چندر کا فن رومانیت اور حقیقت پسندی کا ایسا خوبصورت امتزاج ہے جس پر غلبہ رومانیت کو حاصل ہے۔ کرشن چندر صف اول کے ترقی پسند ادیب تھے لیکن انہیں رومانی ترقی پسند کہنا چاہیئے۔ ترقی پسند فنکاروں میں سجاد ظہیر اور سردار جعفری نے نظریئے کو بڑی اہمیت دی اور کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین اور کرشن چندر ان فنکاروں میں رہے جنھوں نے نظریئے کے ساتھ ساتھ زندگی اور ادب کے دیگر لوازمات کو بھی برتا۔ چنانچہ پروفیسر احتشام حسین نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ کرشن چندر نے ترقی پسندی کا نام لے کر رومانیت کی اشاعت کی ہے۔ اصل میں یہ ہر عظیم ادیب کا خاصہ رہا ہے کہ وہ نہ تو مادہ کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے اور نہ روح کی تازگی سے منہ موڑ سکتا ہے۔ کرشن چندر کی دنیا بھی ان دونوں کے درمیان آباد اور شاد ہے۔

کرشن چندر نے افسانہ کی فنی حیثیت پر کم ہی زور دیا ہے۔ پلاٹ، کردار نگاری اور واقعہ نگاری جیسی چیزیں ان کے ہاں ایسی اہمیت نہیں رکھتیں، انھوں نے ان عناصر پر بہت کم زور دیا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

" افسانے میں چاہے کچھ بھی تجربات کئے جائیں لیکن کہانی پن نہ ہو تو زندگی اسے جھٹک دے گی۔ یہی کہانی پن ہے جو واقعات کو ایک نوع کی فنی تنظیم کی شکل دیتا اور افسانہ کو آگے بڑھاتا اور افسانے کو پلاٹ کی چار دیواری سے باہر نکلنے نہیں دیتا ہے یوں کہانی کا مرکزی خیال بکھرنے نہیں پاتا۔ کرشن چندر نے پلاٹ کے بارے میں عجیب عجیب تجربے کئے ہیں بقول ایک نقاد کرشن چندر پلاٹ کے معاملے میں بہت زیادہ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے "زندگی کے موڑ پر" جیسے پیچیدہ پلاٹ کے حامل افسانے بھی لکھے اور "دو فرلانگ لمبی سڑک" جیسے افسانے بھی، جن کا کوئی پلاٹ ہی نہیں اور انہوں نے معکوسی پلاٹ سے بھی کام لیا یعنی ان کے بعض افسانوں کا پلاٹ وہاں سے آغاز ہوتا ہے جہاں اس کو ختم ہونا ہوتا ہے۔ "موہنجدارو کا خزانہ" اور "ٹیڑھی میڑھی ریل" ایسے ہی افسانے ہیں لیکن کرشن چندر نے پلاٹ کے اعتبار سے اردو ادب کو بعض از حد خوبصورت اور دلکش افسانے بھی دیئے ہیں۔ جیسے "ہملانٹ" ـــ ایک کسان کا اپنی زمین کے لئے پٹواری سے لے کر آسمان پر خداؤں تک پہنچنا اور واپس اپنی زمین پر ہی پٹخ دیا جانا اور اس طرح اس کی خودی کا بیدار ہونا نہایت خوبی سے اس افسانے کے کینوس پر پھیلا دیا گیا ہے۔ و نیز ان کے کامیاب پلاٹ کے حامل افسانوں میں "پالنا"، "چوراہے کا کنواں"، "بھگوان کی آمد"، "بھیڑیوں کا مندر لمیٹڈ"

لائقِ ذکر ہیں ــــــــ اور یہی حال کردار نگاری کا ہے اگرچہ افسانہ میں کردار نگاری کو اور عناصر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن کرشن چندر کا رویہ اس تعلق سے بھی بے نیازانہ اور رومانی ہے۔ وہ اپنے کرداروں پر بہت کم زور دیتے اور عموماً ان کو بیانیہ انداز میں پیش کرتے ہیں اور کرداروں کو افسانہ کے پلاٹ پر قربان کر دیتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو کرشن چندر کی رومانیت ان کے کرداروں کے تعلق سے بھی لائقِ دید ہے۔ ان کے افسانوں کی ہیروئینیں، ہیروؤں سے زیادہ لائقِ توجہ ہوتی ہیں اور یہ ان کی رومانیت ہی ہے کہ ان کے کرداروں پر نہ مفلوک الحالی کا اثر پڑتا ہے اور نہ ظلم وستم اور محنت و تھکن کا ــــــــ وہ لاکھ مفلس ہوں، جور و استبداد کا شکار ہوں، تعجب کی بات ہے اپنی خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے کئی نسوانی کردار اس سلسلے میں بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نسوانی کردار، بے حد غریب اور فاقہ زدہ بھی لیکن غیر معمولی حسین ہیں۔ کرشن چندر ان کے حسن کی تمام جزئیات کو ان کے ناک نقشے اور خد وخال کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ہونٹوں کی یاقوتیت سے لے کر غلافی پپوٹوں والی آنکھوں کی پلکیں تک گن ڈالتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ مسلسل فاقوں محرومیوں اور صعوبتوں کے باوجود یہ حسن برقرار کس طرح رہ گیا ــــــــ ان کے افسانے : 'یوکلپٹس کی ڈالی' کی ہیروئین فاقہ زدہ علاقے میں رہتی ہے لیکن ان کے حسن کی بے مثالی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ چہرہ پر پژمردگی کا نام ونشان نہیں، ہونٹ سُرخ اور رخسار سُرخ و سپید ! افسانے "ایک خوشبو اڑی سی" کی ہیروئین کا بھی یہی حال ہے جتنی خوبصورت ہے اتنی غریب بھی ! ــــــــ کرشن چندر کا ایک بے حد معروف افسانہ ہے "پورے چاند کی رات" ــــــــ کردار نگاری کے زاویئے سے یہ بھی کامیاب نہیں۔ یہاں اسلوب اور اپنی جذباتیت پر کرشن چندر نے کرداروں کو قربان کر دیا ہے۔ ایسے اور کئی افسانے بطورِ مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ کرشن چندر کی کردار نگاری کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے کرداروں کی جگہ لیتے ہیں۔ اس خصوصیت میں میں ان کے افسانہ 'ٹیکسی ڈرائیور' کا ذکر کروں گی۔ اس افسانے کا مرکزی کردار وکرم ٹیکسی ڈرائیور ہے جو عدالت میں جج کی کرسی پر بیٹھ کر فیصلے کرنے لگتا ہے تو وکرم ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ کرشن چندر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح ان کے افسانے 'دانی' کا کردار ــ دانی جو ٹرک سے ٹکرانے کے بعد ہسپتال میں شریک ہوتا ہے لیکن اپنا دماغی توازن کھو دیتا ہے اور پاگل ہو جاتا ہے۔ ہسپتال سے باہر آنے کے بعد،

فٹ پاتھ کے کنارے، سڑک پر تین اینٹوں کی مدد۔ بہت بڑی عمارت بنانے کی سوچتا ہے جس میں رہنے کے لئے ان سب کو جگہ مل جائے گی جو فٹ پاتھ پر زندگی گذارتے ہیں۔ یہ بھی اپنی طرح کی عجیب رومانیت ہے اور پھر "قیدی" کا گجیندر سنگھ بھی ایک کمزور کردار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدار میں رومانی نقطۂ نظر سے انسان کا جائزہ لیا اور بعد میں اشتراکی زاویئے کو اپنایا اسی وجہ ان کے کرداروں میں عام طور پر وہ نکھار اور بانکپن نہیں جو اس کو کسی بھی زاویہ سے ہٹ کر صرف اس کردار کے روپ میں دیکھے۔ قطع نظر اس کے جہاں کرشن چندر کی رومانیت کی لے قدرے مدھم پڑجاتی ہے ان کی کردار نگاری کے جوہر کھلنے لگتے ہیں۔ "چندروکی دنیا" ان کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں طرح طرح کے کردار مل جاتے ہیں۔ انہوں نے مختلف مزاج، رنگ، نسل، پیشے، عمر اور ذات کے افراد پر قلم اٹھایا ہے۔ ایسا لگتا ہے انہوں نے زندگی اور زمانے کا بے حد گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے کرداروں کے دروں ان کے بیچ میں جھانک کر دیکھا ہے۔ بیشتر کردار ان کے افسانوں میں چلتے پھرتے، جیتے جاگتے محسوس ہوتے ہیں۔ "مہالکشمی کا پل" ان کا اس خصوص میں ایک قابل ذکر افسانہ ہے جس کے کئی کردار افسانہ نگار کی ہنرمندی اور اس کے قلم کی تاثیر کا مظہر بن جاتے ہیں۔ کردار نگاری کے سلسلے میں میں ان کے اور چند افسانوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گی۔ افسانہ "بھگت رام" کا بھگت رام طنزیہ کردار نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ بھگت رام کے کردار میں کرشن چندر نے احتجاج کی آواز کو سمو دیا ہے۔ بھگت رام کی بغاوت ایک معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت ہے۔ ایک ایسے معاشرے کو جس پر عیار اور مکار افراد کی گرفت ہے۔ بھگت رام جیسا انسان ہی لرزہ براندام کرسکتا ہے۔ "کالو بھنگی" کا ہیرو، کالو بھنگی، بھگت رام کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا کردار ہے۔ اگرچہ اس افسانے میں کرشن چندر کا اسلوب مسحور کن ہے لیکن جذباتیت اور خطابت کے باوجود یہ کردار کچھ ایسا توانا نہیں۔ افسانہ "موبی" کا کردار موبی عظیم نہ سہی خوبصورت ضرور ہے۔ یہ چند ایک کرشن چندر کے یاد رکھے جانے والے کردار ہیں، بے مثال اور لاجواب! چنانچہ ان کی کردار نگاری کی چند ایک خامیوں کے باوجود اپنے ایسے ناقابل فراموش دلوں کو چھو لینے والے کرداروں کے باعث زندہ رہیں گے۔

کرشن چندر کی حقیقت نگاری اس وقت نکھرتی ہے جب وہ طنزیہ انداز اختیار کرتے ہیں اور ان کے افسانوں کا جذباتی اور رومانی انداز قدرے مدھم ہوجاتا ہے۔ طنز، کرشن چندر کے افسانوں کا ایک اہم عنصر ہے اور اس کا دائرہ ان کے ہاں بے بھی خاصا وسیع! ان کے ہاں طنز کی

انفرادی حیثیت بھی ہے اور اجتماعی حیثیت بھی! وہ افراد کو بھی اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں اور اداروں اور ممالک کو بھی! ان کا طنز بڑا بھاری اور کاری ہوتا ہے اور محض طنز برائے طنز نہیں بلکہ مقصدی اور اصلاحی! ایسے افسانوں کا مطالعہ کیجئے اندازہ ہوگا کہ کرشن چندر کی نظر اپنے معاشرے پر کیسی گہری ہے۔ وہ زندگی کے منفی پہلوؤں، گندگی، غلاظت اور انسانی فطرت کی خباثتوں کو کتنے تیکھے اور زہرناکی لئے ہوئے طنزیہ اسلوب میں ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ کرشن چندر کی حقیقت پسندی ان کی جذباتیت پر غالب آچکی ہے۔ یہ طنزیہ حقیقت نگاری خاص طور پر کرشن چندر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں زیادہ تر ملتی ہے۔ "دو فرلانگ لمبی سڑک"، "زندگی کے موڑ پر"، "بالکونی" اور تقسیم ہند اور فسادات کے موضوعات پر تحریر شدہ ان کے افسانے طنز کے لاجواب شاہکار ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "ہم وحشی ہیں" میں تو طنز اور طنز کے سوائے ہے ہی کیا۔؟ بقول کرشن چندر انہوں نے یہ افسانے انتہائی غم و غصے کے عالم میں لکھے تھے بعد میں انہوں نے اس طرح کی جو کہانیاں لکھی ہیں ان میں "بھوت"، "کالو بھنگی"، "مہالکشمی کا پل"، "بھگوان کی" مطالعہ کے قابل ہیں۔ میں یہاں ان کے افسانوں سے طنزیہ چند اقتباسات پیش کرتا ہوں اندازہ ہوگا:

"یہاں امریکی بلیڈ، جاپانی کلپ، انگریزی صابن، فرانسیسی تیل
اور ہندوستانی غریبی بکتی ہے۔"

"پاربتی ہر روز صبح اٹھتے ہی اس تصویر کے درشن کرتی ہے کیونکہ
جن لوگوں کو لکشمی سچ مچ نہیں ملتی وہ اس کی تصویر ہی دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔"

"انسان کیسی کیسی حالتوں میں مرتا ہے اس کی اتنی حیرت نہیں، حیرت
اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ کیسی کیسی حالتوں میں زندہ رہ جاتا ہے اور
موت کا مقابلہ کرتا ہے۔" (محراب)

طنز و مزاح کا اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے لیکن کرشن چندر کے یہاں مزاح کا عنصر بے حد کم ہے۔ جہاں بھی انہوں نے مزاح نگاری خالص مزاح نگاری کی کوشش کی ہے انھوں نے اپنے معیار کو برقرار نہیں رکھا۔ آپ نے ان کے افسانے "کتا پلاننگ"، "ٹھاکر کی آمد"، "گدادان"، "پرانا قرضہ"

پڑھے ہوں گے۔ ان افسانوں میں فنکارانہ دروبست کی کمی کا اظہار ہوتا ہے اور مزاح آرٹ کی شکل اختیار نہیں کرپاتا۔ "کتا پلاننگ" کا موضوع ہی عامیانہ ہے۔ کتے، بلیوں اور چوہوں کی پلاننگ سے بات شروع ہوتی ہے اور انجام کار کیڑوں مکوڑوں تک جا پہنچتی ہے کہ اگر کتے نہ ہوں تو بلیاں بڑھ جائیں گی۔ بلیاں نہ ہوں تو چوہوں کی بھرمار ہوجائے گی اور اس طرح کیڑوں تک کی باری آجاتی ہے۔ کرشن چندر کے صرف پُرلطف اور رسیلے اندازِ بیان کے باعث قاری ان کے ایسے افسانے پڑھ پاتا ہے۔ مزاح یا تو مواد سے پیدا ہونا چاہیئے یا اسلوب سے، جو مزاح اسلوب کا مرہونِ منت ہوتا ہے وہ اعلیٰ اور معیاری کہلاتا ہے لیکن جب عمداً مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے یا سطحی واقعات بیان کرنے کی کوشش کی جائے اور قارئین سے گویا کہا جائے کہ "بھئی آپ بھی ہنسیئے" تو ایسی صورت میں افسانہ کا چہرہ مسخ ہوجاتا ہے اور صرف افسانہ نگار پر ہنسی آتی ہے افسانوی مجموعوں "مزاحیہ افسانے" یا "ہوائی قلعے" میں ایسے کئی افسانے مل جاتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو جو چیزیں کرشن چندر کو اردو فکشن کا ممتاز اور منفرد فنکار بنا پائی ہیں وہ ان کی منظر نگاری اور اسلوب ہے۔ منظر نگاری افسانے میں نہ صرف رنگ بھرنے کا کام کرتی ہے بلکہ اس کا افسانے کے زماں و مکاں سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ منظر نگاری یوں تو ہر ناول اور افسانہ نویس نے کی ہے۔ خاص طور پر پریم چند اور ان کے ہم عصروں منٹو، بیدی، احمد ندیم قاسمی، قرۃ العین حیدر، حیات اللہ انصاری نے منظر نگاری کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں لیکن ان کے ہاں منظر نگاری کل کے ایک جزو کی حیثیت رکھتی ہے الگ سے شاعری اور غنائیت کا موضوع نہیں جب کہ کرشن چندر کے ہاں منظر نگاری جزو کے بجائے کل ہے۔ سارے افسانے پر چھائی ہوئی روح کی طرح افسانے کے رگ و ریشہ میں دوڑتی ______ منظر نگاری کے تعلق سے کرشن چندر کو بلاشبہ ورڈز ورتھ اور میر انیس کے ساتھ جگہ دی جاسکتی ہے۔ انھیں منظر نگاری میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ وہ مختلف مواقع اور مناظر خاصی تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا حافظہ بڑا غضب کا ہے۔ انھیں ہر درخت، ہر پھل اور ہر پھول کا نام یاد ہے خوبصورت آسمان، پرندے، شفق، چاندنی، ستارے، پھول، سیب، ناشپاتی اور آڑو کے درخت، دریا کا کنارا، بہتے میٹھے جھرنوں کی لطافت، اُن کی روانی، آبشاروں کا حسن، وادیاں، جھیل ______ اور ان کے علاوہ ویران اور سنسان جگہیں، بھیڑ بھاڑ، آبادیاں اور شہر، فٹ پاتھ، دیہات اور کارخانے سب کچھ، سب کچھ کرشن چندر کے ہاں سمٹ سمٹ

آئے ہیں۔ "پرانے خدا" میں پرندا ون' مندر اور' سب سے بڑا گناہ میں' چوپائی کے مناظر' آپ نے ان جگہوں کا نظارہ نہ کیا ہو تو کرشن چندر کے یہ افسانے پڑھ لیجئے۔ میں یہاں ایک اقتباس پیش کرتا ہوں' قدرے طویل ہے لیکن سورج نکلنے اور صبح ہونے کا یہ سماں کوئی اندھا بھی سن لے تو محسوس کرے کہ اس نے یہ منظر دیکھ لیا ہے۔ کتنا دلنواز اسلوب ہے:

" دن بڑا ہی خوبصورت تھا۔ ابھی پو نہ پھٹی تھی اور آسمان پر افق کے چاروں طرف کنارے کنارے پہاڑوں کی سیاہ نوکیلی چوٹیوں کے اوپر بدلیوں کے لچھے الجھے ہوئے تھے۔ مغرب میں بدلیوں کی روئیں گھرتی ہوتی ایک جامد غبار بن گئی تھیں اور مغرب میں پہاڑیوں کی کنواری چوٹیاں اس سیاہ غبار میں یوں ابھری ہوئی تھیں جیسے سیاہ انگیا میں جوانی کے کنول اور پھر بادلوں کے سیاہ لچھے اس غبار کے شمال مشرقی کونے سے اٹھتے ہوئے اور پورب تک پھیلتے گئے تھے۔ پھیلتے گئے اور لچکیلے اور چمکدار ہوتے گئے اور سورج کے منبع کے پاس جا کے بالکل غائب ہو گئے۔ اس منبع کے پاس مطلع اتنا صاف تھا کہ شمع کی لو کا دھوکا ہوتا تھا۔ شمع بستر کے کنارے جل رہی تھی اور رات اپنی زلفیں پھیلائے ابھی تک سو رہی تھی اور شمع کا اجالا بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے تو چوٹیوں کے شفقی ہونٹ بادلوں سے الگ ہوئے۔ کیسی مجبوری تھی ان میں جیسے وہ اس طویل بوسے سے الگ نہ ہونا چاہتے ہوں۔ پھر ایک سپید' سنہری ضیاء منبع سے ابل کر آسمان کے چہرے پر دوڑ گئی' جیسے سوتے میں مسکرا اٹھے ——————
اور رات کی زلفوں کو شمع کی لو نے چھو لیا اور زلفیں پھیلتے پھیلتے بالکل مغرب میں چلی گئیں اور پھر ایک دم اجالا ہو گیا —————— " افسانہ " ایک دن"

اتنے طویل اقتباس کے بغیر منظر نگاری میں کرشن چندر کی لطیف تشبیہات کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ چوٹیوں کے شفقی ہونٹ۔ بادلوں کا طویل بوسہ اور جیسے رات سوتے میں مسکرا اٹھے' اس قسم کی تشبیہات کرشن چندر سے قبل شاید ہی کسی نے استعمال کئے ہوں۔ دراصل یہ افسانہ " ایک دن" کرشن چندر کے ان افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے جن میں منظر نگاری اور اسلوب ایک ہی

تصویر کے دو رخ بلکہ ایک ہی منظر کے دو حصے بن جاتے ہیں۔ کرشن چندر کا اسلوب اور منظر ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کرشن چندر کی منظر نگاری کشمیر، وہاں کی پہاڑیوں، وادیوں، چشموں، ندیوں، جھیلوں، مرغزاروں، چرند، پرند، پھلوں، پھولوں اور انسانی حسن کی مرہون منت ہے۔ کشمیر اور کشمیر کی منظر نگاری کرشن چندر کے وجدان میں کچھ یوں جذب ہو چکی ہے کہ اس کے بغیر ان کی کہانیوں میں رنگ و بو، چمک دمک ممکن ہی نہیں۔ کرشن چندر سے زیادہ ہمارے کسی اور افسانہ نگار نے کشمیر کے مناظر سے اتنا رس نہیں نچوڑا۔ یہ صحیح ہے کہ کشمیر کے بارے میں منظر نگاری کی اس تکرار کے باعث کبھی کبھی ان کے ہاں یکسانیت اور یک رنگی پیدا ہو چکی ہے لیکن بہرکیف ایسا لگتا ہے وہ نیز ہر بار ایک نئے، دلکش اور جاذب نظر اسلوب نے اس منظر نگاری کی لاج رکھ لی۔ حد تو یہ ہے کہ کشمیر، جہلم، گلمرگ، بالکونی، نکڑ، سڑک اور وادی وغیرہ شدت تاثر کی وجہ سے کرشن چندر کے افسانوں میں زندہ کرداروں کی طرح متحرک اور فعال نظر آتے ہیں۔ یہ کسی بھی فنکار کا بہت بڑا کمال ہے اور یہ دو اقتباسات ان کے ایک افسانہ "کالا سورج" سے لئے گئے ہیں۔ ایک وادی ــــــــ ظاہر ہے یہ کشمیر ہی کی وادی ہے، کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے :

> "میدانوں سے پرے، بہت دور اونچے پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک وادی تھی۔ اس وادی کے بیچ میں ایک چھوٹی سی خوشنما جھیل تھی جس میں ایک پتلی سی آہستہ خرام ندی مشرقی پہاڑیوں سے نکل کر آملتی تھی اور جھیل کے دوسرے کنارے سے پھوٹ کر مغربی سلسلہ ہائے کوہ کی طرف چلی جاتی تھی۔"

اور پھر اسی ندی کے کنارے کا منظر :

> "نیچے وادی میں ندی کے کنارے پھل دار درختوں کے مرغزار تھے اور بید مجنوں کے گھنیرے کنج تھے جن کی لانبی مخروطی ڈالیاں دور تک پانی میں جھکی ہوئی چلی گئی تھیں اور دور تک دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ندی کے کنارے کنارے الھڑ دیہاتی دوشیزائیں سر جھکائے، زلفیں بکھرائے، اپنی پتلی انگلیوں کی حنائی پوروں سے پانی میں کھیل رہی ہیں۔"

یوں منظر نگاری اور اپنے اسلوب سے کرشن چندر جادو جگا جاتے ہیں۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا طرۂ امتیاز ان کے اسلوب کا یہی بانکپن ہے۔ اسی سے ان کے فن کو بقائے دوام حاصل ہے۔ ان کی نثر میں وہ دل آویزی ہے کہ شاعری اور تغزل ہزار جان سے اس پر قربان کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے افسانے پڑھیئے۔ بعض مواقع پر ایسا لگتا ہے کہ ہم خوابوں کی فضا میں کھوئے سے جا رہے ہیں، جیسے کانوں میں کوئی شہد ٹپکا رہا ہے۔ پھول کھل رہے ہیں، چشمے ابل رہے ہیں، موتی جگمگا رہے ہیں۔ کتنی غضب کی صناعی ہے :

> "مرنالنی کی آنکھیں بڑی اداس تھیں اور ہونٹ بڑے خوبصورت تھے۔ ان نگاہوں کی اداسی ایک مدھم رنگوں والے غالیچے کی طرح ملائم، مدھم اور خنک آمیز تھی۔ انھیں دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ زندگی کی پُر پیچ اور رخار دار راہوں پر سے گذرتے ہوئے ان سایہ دار پلکوں کے نیچے چند لمحے آرام اور سکون کے بتا دیئے جائیں۔" (مینا بازار)

حسین اور دلآویز الفاظ کا استعمال کرشن چندر نے جس قدر زیادہ کیا ہے، اردو کے اور کسی ادیب نے شاید ہی کیا ہو۔ الفاظ کی تراش خراش اور ان سے جمالیاتی تاثر پیدا کرنے میں ان کو بڑا ملکہ تھا اور پھر ان کے اسلوب کی روانی اور چکا چوند کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ " خوبصورت الفاظ گویا کرشن چندر کی میراث ہیں۔"

نادر، اچھوتی اور لالہ کار تشبیہات نے کرشن چندر کے اسلوب کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ ان کا تخیل کتنا وسیع، کتنا گہرا ہے کہ وہ جیسے نامعلوم جزیروں سے ان تشبیہوں کو ڈھونڈ لاتے ہوں۔ کتنی نازک، کیسی کومل ہیں یہ تشبیہات :

> "پتوں اور ڈانڈوں کے اتصال پر مکئی کے بھٹے سنہری فرغل پہنے اپنے سر پر کالے بالوں کی چوٹیاں لہرائے ان دوشیزاؤں کی طرح بے قرار نظر آتے ہیں، جو میلے میں جانے کے لئے بے تاب ہوں۔" (کاک ٹیل)

اور اب ان کا افسانہ "مکئی کے دانے" جہاں انہوں نے تشبیہات کے پھول ہی پھول کھلا دیئے ہیں، ملاحظہ فرمایئے :

> "ایک لمحے کے لئے نظر [illegible] کی ہتھیلی سے مس ہوئی اور ٹھاکر سنگھ کو ایسا لگا کہ جیسے دور دور تک شاخیں پتوں سے بھر گئیں۔"

دوسرا جملہ :

"ٹھاکرانی نے ہتھیلی پر اپنی خوبصورت انگلی رکھ دی اور ٹھاکر سنگھ کو
ایسا لگا جیسے کبوتری شاخ پر بیٹھ گئی۔"

فطرت کی طرح کرشن چندر حسنِ نسوانی کے بھی پرستار ہیں۔ حسنِ نسوانی ان کے افسانوں میں اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور تابناکیوں کے ساتھ موجود ہے انھوں نے حسنِ نسوانی کو جھومتے' جھکتے' رنگین' حسین اور دلکش الفاظ میں اور مزے لے لے کر بیان کیا ہے کہ خود الفاظ سے جوانی جھلک پڑتی ہے' دیکھئے یہ تحریر نہیں کرشن چندر نے حسن کو پیرہن دے دیا ہے:

"آنکھوں میں جوانی ناچ رہی ہے۔ تبسم زیرِ لب کانپ کانپ جاتے ہیں۔ رخساروں کے سیب چمک رہے ہیں جیسے شفق کی ڈالیاں جھک گئی ہیں اور غربی آسمان کے باغ کی رعنائی ان جسموں میں اتر آئی ہے۔"

کرشن چندر کو اپنے اسلوب کی اس رنگینی اور طرحداری کا پورا پورا احساس ہے کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اسلوب میں نئے نئے تجربے کئے۔ اسلوب کو متحرک اور رواں دواں رکھا۔ ظ۔ انصاری سے اپنی ایک گفتگو میں انہوں نے کہا تھا :

"میں اسٹائیل کو جامد نہیں بلکہ متحرک اور مقناطیسی طاقت سمجھتا ہوں جو
بدلتا رہتا ہے میں نے اسٹائیل میں اتنے تجربے کئے ہیں جو
اردو میں کسی نے نہیں کئے"

کرشن چندر'۔۔ یہ درست ہے ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن رہے لیکن ان کے دل میں رومانیت کی شمع بھی جلتی رہی۔ انہوں نے حقیقت پسندی سے کام لیا لیکن جمالیاتی اقدار سے بھی ان کا رشتہ محکم رہا۔

ادب برائے زندگی ان کی زندگی کا مطمحِ نظر رہا لیکن ان کے پاس کئی افسانے ایسے بھی ہیں جو "برائے زندگی نہیں' صرف برائے ادب ہیں۔ 'کچرا بابا' اور 'پہلا دن' وغیرہ ان کے ایسے ہی افسانے ہیں جو کرشن چندر کے معلوم نہیں ہوتے۔ ان کے پاس ایسے افسانوں کی تو بہتات ہے جن میں پلاٹ اور موضوع شاید ہی ہو۔ صرف منظر نگاری اور اسلوب کی چمک دمک ہے۔ جذباتی انداز بیان ہے اور رومانی طرز تحریر ہے۔ انھوں نے مجموعی طور پر اردو افسانے کو اپنے طور پر ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ معاشرے کی فرسودگی'

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

غزلیں

رفعت سروش

جو برہم ہے نگاہِ ناز ہر شے فتنہ ساماں ہے
گلستاں شعلہ پیکر ہے، ہوائے گل پریشاں ہے

زمیں کے قلبِ سوزاں میں جہنم ہی جہنم ہیں
فسادِ عقلِ انسانی سے خود یزداں بھی لرزاں ہے

یہ کیسی پیاس ہے صدیوں سے جو بجھنے نہیں پاتی
یہ کیسی کربلا ہے جو بیاباں در بیاباں ہے

لکھا دستِ ازل نے حرفِ دانش میرے سینے پر
یہی توریت ہے، انجیل ہے، گیتا ہے قرآں ہے

سفینہ آ لگا عمرِ رواں کا جب کنارے پر
تو کیا موجِ بلا کیسی ہوا، کیا جوشِ طوفاں ہے

خیرات ندیم

فضیلتِ علم کی جھوٹی انا کے لہجے میں
کہیں غرورِ عبادت دعا کے لہجے میں

پکارتا ہے زمانہ بہ شانِ جمہوری
ارادتاً ستم ناروا کے لہجے میں

بدل چکا ہے بہت شہرِ دلبراں کا مزاج
عجیب زہر ہے آب و ہوا کے لہجے میں

کہیں کہیں ابھی قدرِ حیات زندہ ہے
خلوص مجھ کو ملا ہے وفا کے لہجے میں

سخنوری کا بھی انداز والہانہ ہے
نشہ ٹپکتا ہے طرزِ ادا کے لہجے میں

خطوطِ جسم سے آگے بھی سوچنا ہے کچھ اور
ہے بانکپن تو بہت ارتقا کے لہجے میں

ندیم اہلِ وفا کو سنائی دیتی ہے
صدائے تشنہ لباں نینوا کے لہجے میں

صفیہ اریب

چار نظمیں

(۱)

سبھی اقدار کی
کرچوں کا
بے پایاں خزانہ
دفن ہے سینے میں ۔۔۔ !
اور
اک ناگ ۔
پھن پھیلائے ۔
پہرہ دے رہا ہے ۔
اس خزانہ پر ۔ !

(۲)

زندگی ۔
غبار میں لپٹی ہوئی ہے ۔۔ !
گرد ۔
سانسوں کی غذا ہے ۔۔۔ !
رگوں میں
دوڑتی ہے خون بن کر ۔ !
ہر شئے دبی پڑی ہے !
ماضی ۔
بسر ہو چکا ہے ۔ !
یہ لمحہ ۔
جسے میں جی رہی ہوں
گرد ہی کی
اک لہر ہے ۔۔ !

(۳)

ہر غم سے
کچھ اپنا سلسلہ
محسوس ہوتا ہے ۔ !
تسلی میں کسی کو
دے نہیں سکتی !
سمندر کی کوئی
سرحد نہیں ہوتی ۔ !
فصیلیں ۔۔ ذات کی
غم کا احاطہ
کر نہیں سکتیں ۔ !
کہ ۔
یہ الفاظ کا صحرا
تہی دامن ہے خود ہی ۔۔ !

(۴)

ویرانے کو
سجا رہی ہوں
دوہری زندگی کے لیئے ۔ !
ویرانی تو
ہر جگہ ہے !
چاہتی ہوں
ویرانہ ۔۔۔ کم سے کم باہر سے
آباد لگے ۔ !

قطب سرشار

دو غزلیں

مروّتیں بھی غلط ہیں ترا حسد بھی غلط
قبول بھی ترا جھوٹا ہے اور رد بھی غلط

نفی کے رمز میں اثبات بھی ہے پوشیدہ
صفر شناس نہیں ہو تو پھر عدد بھی غلط

اگر تو چاند نہیں میں بھی کوئی بحر نہیں
تری کشش بھی غلط میرا جذر و مد بھی غلط

فضول کون یہاں کس کا بوجھ اٹھاتا ہے
مرا سپاس بھی باطل تری مدد بھی غلط

وفا کی حد میں سبھی ترک و اختیار بجا!
ضمیر زندہ نہ ہو تو ہر ایک حد بھی غلط

نظر تو وہ ہے جو منظر کے رمز پڑھتی ہے
اگر ہو محوِ تماشا نگاہِ صد بھی غلط

دلوں کا درد سمجھنا خرد کے بس میں کہاں
ہمالیہ کی سی فہم دراز قد بھی غلط

تم کو یہ شکایت ہے ترسیل نہیں ہوتی
فطرت کے اشاروں میں تفصیل نہیں ہوتی

بے شکل و شباہت کی تشبیہ بھلا کیا دوں
احساس ہی ہوتا ہے تمثیل نہیں ہوتی

مفہوم نہ ہو جب تک الفاظ کے سینے میں
احکام ہی ہوتے ہیں تعمیل نہیں ہوتی

صد بحر حوادث سے مٹتی نہیں سرمستی
یہ ریت ہے پانی میں تحلیل نہیں ہوتی

دنیا کی کہانی ہے اک سلسلہ جنبانی!
افراد بدلتے ہیں تکمیل نہیں ہوتی!

سرشار نہیں آساں یوں دل میں اتر جانا
احساس کی گہرائی کچھ جھیل نہیں ہوتی

سید عبدالستار

دکنی شاعری اور ہندوستانیت

ہندوستانیت' ایک فلسفیانہ اور ادبی تصور ہے جو اس برصغیر کی نت نئی تہذیبوں کے میل ملاپ' معاشرتی بندھنوں اور معاشی رابطوں سے جنم لیتا ہے اس موضوع کا تعلق دکنی شاعری سے ہونے کے سبب اب ہم دکنی شاعری کی طرف رجوع کریں گے کہ دکنی شاعری میں ہندوستانیت کی کیا اہمیت ہے۔

دکن جب اردو شاعری کا مرکز قرار پایا تو مقامی اثرات کو قبول کرنے کے باعث اور شمال سے دوری کی وجہ سے یہاں کی شاعری دکنی کہلائی۔ دکنی شاعری میں ہندوستان کی اہمیت اور افادیت اور ہندوستانی عناصر کی اکثریت کی ایک خاص وجہ سلطنت دکن کا بہمنیہ سلطنت کے ان لوگوں کے ہاتھوں میں آنا ہے جو اپنے آپ کو شمالی ترک ہونے کے باوجود دکنی کہنے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ خصوصاً سرزمین دکن سے ان کے جذباتی لگاؤ نے دل کھول کر مقامی روایات کی ہمت افزائی کی اور دیسی رسم ورواج ' میلوں' ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی۔ یہاں کے شعرا نے ہندوستانیت کو دکن تک محدود کرکے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ دکنی شاعری کو ہندوستانیت کی مکمل اور مفید ترجمانی کہنا بے جا نہ ہوگا۔ دکنی شاعری پر شروع ہی سے ہندوی اثرات غالب رہے ہیں۔ بہمنی دور میں نظامی سے لے کر میراں جی تک اور عادل شاہی و قطب شاہی دور کے ابتدائی شعراء کے ہاں ہندوی اثرات اپنے گہرے آب و رنگ کے ساتھ نمایاں ہیں

دکن میں نظم پہلے وجود میں آئی جس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداً دکن میں شاعری کو مذہبی اور تبلیغی مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جس کے لئے بجائے دوسری اصناف کے نظم بہت ہی

کار آمد صنف سمجھی جاتی تھی۔ اپنے قریب کی اشیاء اور ماحول کی عکاسی کا رجحان ابھرا تو شعرا یہاں کے رسوم، تہواروں، تقریبوں اور دوسرے مظاہر کے بیان میں اپنے زمانے کی معاشرت اور تہذیب کے جواہرات کو محفوظ کرنے میں کامیاب رہے۔ دکنی نظم عموماً قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کے روپ میں ابھری۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے یہ تمام اصناف ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں مگر ان کا خارجی اشیا اور واقعات کو مس کرنا، انھیں نظم کے دائرے میں لے آتا ہے۔ نظموں میں نہ صرف ہندی الفاظ بہت زیادہ ہیں بلکہ ان میں سے اکثر خالص ہندوستانی مزاج کے متحمل نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ عشقیہ نظموں میں بھی جہاں بجائے مرد کے عورت کو مخاطب کیا گیا ہے نسوانی لہجے سامنے آتے ہیں۔ نظم سے ہٹ کر جہاں غزل کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا ہے وہاں بھی لہجے کے اعتبار سے دیسی اثرات ہی کا تسلط قائم ہے۔

دکنی دور میں شعراء نے غزل میں بھی بہت کچھ کہا تاہم اس کو نظم ہی کا دور کہہ سکتے ہیں دکنی شاعری میں مظاہر وطن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جس کے نتیجہ میں یہاں کے پھل، پھول، بادل و برکھا اور پرندوں وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی شاعری کی تقلید میں دکنی شاعری میں بھی عورت کی طرف سے عشق کا اظہار ہوا ہے دوسرے شام اور منتر ٹونا وغیرہ الفاظ ہندو اساطیر کو سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً

اب چھوڑ میں مت جاوے رے
تج برہ جلی کوں مت جاوے رے
یو جانے تو مری من بھاوے رے

یو تو شام سلونا توں میرا رے
نہ چلے تج اپر منتر ٹونا رے
جو کوئی چاہے سو فانی ہونا رے

(برہان الدین جانم، سولھویں صدی عیسوی)

وزیر آغا کا کہنا ہے:

" دکن حملہ آوروں کی مسلسل یلغار سے نسبتاً محفوظ رہنے کے باعث ہندوستان کی قدیم فضا اور اس کے نتیجے میں بھاشا کی شاعری سے زیادہ قریب تھا" [1]

---

[1] اردو شاعری کا مزاج۔ وزیر آغا ص ۲۶۸

دکنی قصیدوں میں ہندوستانیت نے محل وباغ کی تعریف وتوصیف، رہن سہن کے آداب، لباس، چال ڈھال اور دیگر طریقہ ہائے زندگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مرثیوں کا ہیئت اور مزاج کے نقطۂ نظر سے گیت کے ذیل میں آنا بھی ہندوستانیت کی دلیل ہے وہ مرثیے جو راگ راگنیوں کے مطابق تحریر کیے گئے ہیں ان میں راگ راگنیوں کے نام تک ملتے ہیں۔ دکنی کی مثنویوں میں ہندوستانی قصّوں ہی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عاجز کی مثنوی "لیلیٰ مجنوں" نام کی حد تک بیرون ہند موضوع کی حامل معلوم ہوتی ہے مگر اس کی تہذیبی فضا خالص ہندوستانی ہے جو اس برصغیر کی ایک عورت ہے اور اس کے جذبات واحساسات اس برصغیر ہی کی روایت کے لئے وابستہ ہیں۔

دکنی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہندوستانیت اپنے آپ اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دکنی شاعروں نے ہندوستانی تہذیب یا ہندو دیومالائی عناصر کو اپنی شاعری میں جگہ دینا شاید لازمی قرار دے دیا تھا۔ اس سلسلے میں دکنی شاعروں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے جن میں نہ صرف پیشہ ور شاعر بلکہ بادشاہ شاعر بھی پیش پیش رہے ہیں جنھوں نے ہندوستان سے متعلق کئی پہلوؤں پر مضامین باندھے ہیں۔ اب ہم دکنی شعراء کے کلام کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ جن کی شاعری میں ہندوستانی عناصر بدرجۂ اُتم پائے جاتے ہیں۔

عادل شاہی دور میں جو نامور دکنی شعراء گذرے ہیں ان میں ابراہیم عادل شاہ ثانی (جگت گرو) ایک اہم بادشاہ شاعر ہے۔ جو اپنے ہم عصروں اکبر اعظم اور محمد قلی کی طرح ہندوستانیت کا حد درجہ دلدادہ تھا۔ ہندی لباس، زبان اور طرز معاشرت سے اس کو بڑی دلچسپی رہی ہے اور ہندی موسیقی کا تو وہ خود ماہر تھا۔ اس کی مشہور شعری تصنیف "نورس" کو ذیر بحث لائیں جو اگرچہ پوری دکنی میں نہیں لیکن ان میں بعض راگ راگنیوں کو بلا جھجک دکنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو اس کے کلام کی ہندوستانیت ایک حد تک نمایاں ہو جائے گی۔ ابوالفیض سحر اس مشہور و معروف تصنیف کے تعلق سے یوں کہتے ہیں۔

"ہندو دیومالائی عناصر کے تعلق سے ایسے اردو کے دکنی عہد کی نمائندہ شاعری قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے بیشتر گیت ہندو دیومالا سے بھرے ہیں، شیو، پاروتی، سرسوتی، گنیش، اور اندر جیسے

دیوی دیوتاؤں کا ذکر اس میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ

بار بار آتا ہے۔" ؎۱

مثال کے طور پر :-

نورس سور جگ جوتی آلڑ سور گنی   پوست سرستی ماتا ابراہیم پرساؤ جنی دو نی

شیو جی کا سراپا ہے :-

بھیرو کر پور گورا بھال تلک چندرا   تیری ختر اجٹا مکٹ گنگا دھرا

علی عادل شاہ ثانی ، متخلص بشاہی بنیادی طور پہ دکنی کی طرف مائل رہا۔ جس کی وجہ سے اس کی مادری زبان کا دکنی ہونا اور اس کی طبیعت کا اسی زبان میں شاعری کی طرف مائل ہونا ہے۔ شاہی نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے اس کے دیوان میں نظموں کے مقابلے میں قصیدوں کی تعداد بہت ہے۔ جن میں قصیدہ ' علی داد گلی ' بہت اہم ہے۔ محل پر تبصرہ ہندوستانی طرز تعمیر تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ قسم قسم کے پھولوں میں چنبیلی ' جوہی اور گلاب کے نام ہندوستانی پھولوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ شعر ہے :-

چنبیلی جو چمبیلی ہے ' نئی نازک نویلی ہے   گلاں کے مست ہیلی کر کلا مجلس میں لے آیا ہے

اسی دور میں ملا نصرتی دکنی شاعری کا مسلم الثبوت استاد مانا جاتا ہے۔ یہ قدیم اردو کے شعرائے عظیم میں سے ایک ہے جس نے بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی مثنویوں سے اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ بٹھایا ہے اس کی پہلی تصنیف مثنوی " گلشن عشق " ہے جس میں ایک مشہور دکنی عشقیہ داستان " منوہر و مدمالتی " کو بیان کیا گیا ہے اور مثنوی " علی نامہ " رزمیہ ہے ' جس میں اس دور کی تہذیب ' معاشرت اور کلچر کو واقعات کا حصہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ نصرتی کی غزل کا موضوع بھی عورت ہے۔ چند غزلیں ہندوی شاعری کی روایت میں ایسی بھی ہیں جن میں عورت اپنے کی کیفیات کا اظہار کرتی ہے۔ مثلاً :-

میں مست ہو کر سیج میں بیتاب ہو رہی تھی پیٹ   باتاں پر مرکی کا ڑ کو تیغ کیوں جگاتا ساد سے

کشتی مری امید کی تھی ' برہ کے طوفان میں   تیں پر ہدان گرداب ہو ' پھر ڈباتا ساد سے

قطب شاہی سلطنت کے عہد میں محمد قلی قطب شاہ ' عبداللہ قطب شاہ ' غواصی اور

؎۱ تیشۂ نظر : ص ص ۱۸ ، ۱۹

ملا وجہی کے کلام کی بہت قدر ہوئی۔ محمد قلی کا ضخیم کلیات دکنی شاعری اور ہندوستانی عناصر میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اپنی عربی سے واقفیت، فارسی دانی، علوم اسلامی سے آگاہی اور ایرانی تہذیبی قدروں کی حامل ہونے کے باوصف محمد قلی وہ شاعر ہے جس نے ہندوستانی تہذیب کی روح کو نہ صرف سمجھا بلکہ لباس اور رسم ورواج کی حد تک ان کو اختیار کیا اور شعروادب میں ان کو یوں سمو گیا کہ آج تک بھی اپنے شعروادب میں ہندوستانی تہذیبی عناصر کی عکاسی اور ترجمانی میں کوئی بھی شاعر محمد قلی کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ محمد قلی نے نہ صرف یہ کہ ایک فرمانروائی حیثیت سے ہندوستان اور ہندوستانیت سے محبت کی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ایک شاعر کی حیثیت سے ہندوستانی تہذیب، رہن سہن، رسوم وآداب اور یہاں کے رنگ ڈھنگ کو اپنے کلام کا موضوع بنایا اور کئی طرح ان موضوعات پر طبع آزمائی کی اور ان کو نوع بہ نوع انداز سے صفحۂ قرطاس پر پیش کیا کہ ہندوستانی تہذیب غیر معمولی دلکش انداز میں ہمارے سامنے آتی ہے اس کی نظموں کا ہر لفظ ملک کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس میں یہاں کی زمین، جھومتی، فضائیں گنگناتیں اور ذرہ ذرہ ناچتا نظر آتا ہے۔ اس کی شاعری کی فضا سراسر ہندوستانی ہے۔ محمد قلی کی شاعری پر ہندوستانیت کی گہری چھاپ کو دیکھ کر ڈاکٹر زور نے یہ کہا ہے کہ 'وہ ہندوستان کا پہلا شاعر ہے۔ جس کی اردو شاعری کے تانے بانے جدید شاعری سے جا ملتے ہیں اور ڈاکٹر حکم چند نیر نے بجا کہا ہے:

> "اردو شاعری میں وطن کا ذکر سب سے پہلے محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں ہندوستان کے پھلوں، پھولوں، موسموں، تیوہاروں، عمارتوں اور پرندوں کا ذکر ملتا ہے۔" [1]

نمونہ کلام :-

اناراں میں تجھے دانے سو جیوں یاقوت پتلیاں میں
ہر اک پھل اس اناراں پر تجھے سکتے نمن ساہے
ہوا آئی ہے لے کے بھی ٹھنڈ کالا
پیا بن سنانا مدن بالے بالا
بہار سے بسنت کا ہوا آئیا
سکیاں تن مشک و زعفران لایا

[1] سرور جہاں آبادی "حیات اور شاعری" ڈاکٹر حکم چند نیر صہ ۱۸۹

عبداللہ قطب شاہ کے کلام کو دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی محمد قلی کے نقش قدم پر چل کر منقبت، برسات، مولود اور دوسری ہندوستانی تقریبوں پر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ شاعری اور موسیقی کو بہت پسند کرتا تھا۔ اس نے جگت گرو کی شعری تصنیف "نورس" کے جواب میں ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ موسیقی سے شاعری کو ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں :

چندر کلا تیرا کلا ہے نرملا اُجلا
تو منج بھلا کے مبتلا کیا کلا و نرملا

نین میں لا توں کا جلا تیا بلا نکمہ گلا !
کس اُچپلا ہلوں ہلا کے چُلبلا ہے دوبلا

عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں جس شاعر کو ملک الشعراء کی حیثیت حاصل تھی وہ غواصی ہے جس کی تین مثنویاں، مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال اور طوطی نامہ شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 'مینا ستونتی' کا قصہ اصلاً ہندوستانی ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں ایک عوامی کہانی کی حیثیت رکھتا تھا۔ غواصی نے اس کہانی کو دکنی مزاج اور رنگ روپ میں ڈھالا ہے۔ اس کے تمام کردار ہندو ہیں۔ دوسری مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' میں راکششں اور دیو بھوت کا ذکر ہندو اساطیر کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناگن ڈائن اور بڑا بھوت کی قلمی تصویریں دیکھ کر پڑھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سامنے زندہ ڈائن اور بھوت کھڑے ہیں۔ مثلاً :

تیا کچھ بدشکل بیہودا تھا !	جو دیکھن سے اسکوں زہرہ نہ تھا
فرشتے بھی ڈرتے رہتے کشش پر	اتر آؤ نے اس زمیں فرش پر
بڑا بھوت اپنے سو تھا آپ دو	کہ تھا سار سے بھوتاں بیرا باپ وو

دکنی شاعری میں 'قطب مشتری' اور 'سب رس' جیسے نثری و شعری شاہکار کے خالق ملا وجہی کو بے پناہ اہمیت حاصل ہے۔ مثنوی 'قطب مشتری' میں محمد قلی اور بھاگ متی کے عشق کی داستان منظوم کی گئی ہے۔ 'قطب مشتری' میں جنوں پریوں، بھوتوں اور راکششوں سے لڑنے جھگڑنے کے ذکر سے بھلا کس کو انکار ہو سکتا ہے جو کہ اس وقت کی داستانوں کے عین مطابق ہے۔ راکششں پر بادشاہ کے تیر چلانے اور اس کے زمین پر گر پڑنے کا منظر ملاحظہ ہو :

کشش کر جو نہ تیر مارے سو دو   پڑیا بھیس پہ تل سیرا پہ پانوں ہو

الٹ یوں دسے زخم سینیر میں کہ جیوں عکس اپنے جھاڑ کا نیر میں

دکنی شاعری کا سربرآوردہ شاعر جو ایک عہد کا خاتم اور دوسرے عہد کا بانی ہے وؔلی دکنی تھا۔ اس کے کلام میں ہندوستانیت کے عناصر پورے آب و تاب کے ساتھ ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وؔلی نے اپنی غزلوں میں معشوق کا جو رنگ بھرا ہے وہ صرف ہندوستانی ہی ہوسکتا ہے اس کے کلام میں جو ہندوستانی عناصر نظر آتے ہیں وہ محض ایک اتفاق نہیں، بلکہ عملاً انھیں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ وؔلی نے اپنی شاعری میں ارجن، کشن، گوپیوں، دیوالی، بانسری اور گنگ و جمن کے علاوہ ہندی تلمیحوں کو بھی جگہ دی ہے۔ دو شعر ہیں :۔

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تج سوں اے صنم
ترکش میں تج نین کے ہیں ارجن کے بان آج

زلف تیری ہے موج جمنا کی پاس تل اس کے جیوں سنا سی ہے

نظام شاہی سلطنت بھی شعر و شاعری کی خوش گوار فضا سے معمور تھی۔ یہاں کے شعراء میں حسن شوقی کی دو مثنویاں 'فتح نامہ نظام شاہ' اور 'میزبانی نامہ' خاص طور پر مذکور ہیں۔ صرف مثنویوں اور غزلوں میں درج اشعار ہی سے ہندوستانیت کی بو آتی ہے۔ مثال کے طور پر 'فتح نامۂ نظام شاہ' کے یہ شعر سنئیے ؎

نہ آب بھنور تالب نہ بدا !
نہ چھوڑوں تونگر نہ چھوڑوں گدا

کروں دور بنیاد اسلام کی
جو مانے ڈرا ہے جگت رام کی

شاہ امین الدین اعلیؔ کا شمار دکن کی برگزیدہ ہستیوں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف 'کلام اعلیٰ' 'وجودیہ' اور 'محب نامہ' نظم میں ہیں۔ ریختہ اور غزلوں کے علاوہ مخصوص راگ راگنیوں کے مطابق گیت اور دوہرے بھی ترتیب دیئے گئے ہیں۔ نظامؔی بیدری کی مثنوی 'کدم راؤ اور پدم راؤ' بھی قصے اور نام کے اعتبار سے ہندوستانیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے آنے میں مدد دیتی ہے غرض ایسی بے شمار شخصیتیں دکنی شاعری میں ملتی ہیں جن کی ادبی و فنی کوششوں سے ہندوستانیت کا ننھا سا پودا بارآور ہونے لگتا ہے۔

نقد و نظر

- تبصرہ کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔
- تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں اردو شعر و ادب کی ترقیات سے بحث کرتے ہوئے عموماً حیدرآباد کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ اگر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں حیدرآباد کی شعری اور ادبی محفلوں پر دہلی ہی کے بعض باکمال چھائے ہوئے تھے۔ ان میں مرزا علی لطف، شیخ حفیظ دہلوی اور آخر میں شاہ نصیر دہلوی کو خصوصیت حاصل رہی ہے۔ ان باکمالوں کو محض اس بنا پر نظرانداز کر کے کہ وہ دہلی سے کہیں اور چلے گئے تھے خود اہلِ دہلی کی خدمات کا جو بھی جائزہ پیش کیا جائے گا تو ناقص ہوگا۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دہلی کے ان با استعداد استادوں نے حیدرآباد کی علمی اور ادبی فضا پر جو اثرات مرتب کیے تھے اردو ادب کی تاریخ میں ان کی بھی اہمیت ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ کام خاص اہلِ حیدرآباد ہی کے کرنے کا ہے۔

آج کل یونیورسٹیوں میں ادوار سے متعلق تحقیقی کام کرنے کا چلن زیادہ ہو گیا ہے لیکن غالباً زیادہ مناسب بات یہ ہوگی کہ اگر مواد دستیاب ہو اور گنجائش نظر آئے تو افراد کو موضوع بنایا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنیادی حقایق زیادہ صحت اور قطعیت کے ساتھ متعین طور پر سامنے آجائیں گے۔ ان متعین حقائق کی روشنی میں پورے دور کے بارے میں زیادہ بہتر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ حیدرآباد کے بعض باصلاحیت نوجوانوں کو اس پہلو کی طرف توجہ ہوئی ہے اور مذکورہ دور کے اہم تر شعرا سے متعلق کئی نہایت قابلِ قدر کام

سامنے آچکے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "دیوانِ لطف" بھی انھیں میں سے ایک ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر ہیں۔ وہ حیدرآباد کے رہنے والے نوجوان، باہمت، با استعداد اور مخلص شخص ہیں۔ پی۔ ایچ ڈی کی اعلا سند کے لیے انھوں نے مرزا علی لطف کی حیات اور خدمات کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر رفیعہ سلطانہ اور پروفیسر غلام عمر خاں جیسے تجربہ کار اور جہاندیدہ اساتذہ بھی اس مقالے کے مدّاح ہیں۔ ہمارے نزدیک زیادہ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ڈاکٹریٹ کی سند مل جانے کے بعد بھی روشِ عام کے برخلاف ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے موضوع سے دلچسپی کو برقرار رکھا ہے اور تلاش و جستجو کے کام میں لگے رہے ہیں۔ ان کی یہ لگن لائقِ ستائش ہے کیونکہ اس کے بغیر حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گذشتہ سال انھوں نے "دیوانِ لطف" ترتیب کرکے اپنے شوق کے زندہ ہونے کا ایک زندہ ثبوت پیش کیا ہے۔

پروفیسر غلام عمر خاں صاحب نے جو بذاتِ خود بھی حسنِ خلق اور خلوص محبت کا پیکر ہیں مرزا اکبر علی بیگ کے بارے میں ذاتی تجربے اور علم کی بنیاد پر لکھا ہے کہ: "ڈاکٹر اکبر علی بیگ صاحب کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں تو اسے انہماک، جاں فشانی اور سلیقے کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشِ نظر تحقیقی کاوش بھی متذکرہ خصوصیات کی آئینہ دار ہے..... کلامِ لطف کی پیشِ نظر ترتیب و تدوین متنی تحقیق و تنقید کا کامیاب نمونہ ہے۔"

(ص ص ۸، ۱۰)

راقم کا تجربہ یہ ہے کہ ادھر جو کتابیں مدوّن ہو کر شائع ہو رہی ہیں بیشتر کو دیکھتے ہی زبان پر یہ مصرع آجاتا ہے کہ ؎ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

لیکن زیرِ تبصرہ دیوانِ لطف کو پڑھنے کے بعد سب سے زیادہ خوشی یہ جان کر ہوئی کہ اکبر علی بیگ صاحب تدوین کے جدید اصولوں سے باخبر ہیں۔ اپنے کام کے بارے میں انھوں نے خود کہا ہے کہ:

"اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی ایک مخطوطے کی غیر ضروری تقلید نہ کی جائے بلکہ مصنف کے ساتھ انصاف کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے۔ اس سلسلے میں وہی متن قبول کیا گیا ہے جو زبان اور اسلوب بیان کے اعتبار سے مصنف کی زبان اور اسلوبِ بیان سے زیادہ قریب معلوم ہو۔"

اس بارے میں شبہ کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ علی لطف سے متعلق ایک مبسوط مقالہ کی تکمیل کے بعد مرزا اکبر علی بیگ نے اس کی علمی حیثیت بلکہ استعداد اور اس کی زبان اور بیان کے معیار اور مزاج کے بارے میں فی الجملہ ایک رائے ضرور قائم کر لی ہوگی۔ علی لطف کی لفظیات کا بھی انھیں اندازہ ضرور ہو گیا ہوگا۔ اس کے املا اور تلفظ وغیرہ کے امتیازات بھی ڈاکٹر اکبر علی بیگ کے پیش نظر ہوں گے۔ وثوق سے کچھ کہنا ممکن نہیں لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سلسلے کی کچھ بحثیں انھوں نے اپنے مبسوط مقالے میں کی ہوں گی لیکن اب جب کہ وہ دیوان لطف شائع کر رہے تھے مناسب یہ تھا کہ اس کے مقدمے میں بھی مختصراً ہی سہی لیکن ان امور سے متعلق معلومات ضرور فراہم کرتے تاکہ اس شخص کے لیے جس نے ان کا مقالہ نہیں دیکھا ہے ان کے ان دعوے کی صحت کا اندازہ کر لینا بھی ممکن ہو جاتا کہ انھوں نے متن کی تیاری میں علی لطف کے ساتھ واقعی انصاف کیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے اپنے ماخذ کا جس طور پر تعارف کرایا ہے وہ قابل ذکر ہے۔ اس تعارف کے بعد یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں کہ انھوں نے تمام ماخذ سے کما حقہٗ استفادہ کیا ہے البتہ اس بات پر ضرور تعجب ہوتا ہے کہ اختلافاتِ نسخ زیادہ نہیں ہیں۔ شاید صرف اہم تر اختلافوں کی نشاندہی کو کافی سمجھا گیا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ تدوین کے لیے تمام اختلافوں کی نشان دہی مناسب ہے۔ بعض وقت بہت معمولی اختلافات بھی اہم نتائج تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

دیوانِ لطف کے مقدمے میں ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے لطف کے سوانح اور ان کی شاعری وغیرہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ بہ گمان غالب یہ سب مباحث انھوں نے اپنے مبسوط مقالے سے اخذ کیے ہیں۔ جو بھی ہو، یہ مباحث مفید ہیں اور ان سے علی لطف کا تعارف حاصل ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ نے دیوانِ لطف کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش میں اس کے آخر میں لطف کی لفظیات کی ایک فرہنگ بھی شامل کر دی ہے۔ اس کے نفع بخش ہونے میں شبہ نہیں۔ دیوانِ لطف کی ترتیب کی اشاعت کے لیے ڈاکٹر موصوف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ توقع کی جانی چاہیے کہ علمی حلقوں میں اس مفید کام کی کما حقہ پذیرائی ہوگی اور اپنی متنوع صلاحیتوں سے کام لے کر ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ آیندہ اور بھی قابلِ قدر کارنامے سرانجام دیں گے۔

کتاب اچھے کاغذ پر صاف ستھری چھپی ہے اور اس کی قیمت پچیس روپے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

وقار خلیل

اردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۶ر جولائی: بزرگ اور قادر الکلام
شاعر حضرت عبد القادر خان خسرو
مرحوم کے مجموعۂ کلام "شب گردی
خسرو" کی رسم اجراء ڈاکٹر ایم چنا ریڈی
سابق چیف منسٹر آندھرا پردیش
نے انجام دی۔ مسز روڈا مستری ایم پی
نے صدارت کی۔ جناب محمود انصاری
نے بہ حیثیت مہمان خصوصی خطاب
کیا۔ محفل شعر میں کنول پرشاد کنول،
پروفیسر مغنی تبسم، سعید شہیدی،
صلاح الدین نیر، اطہر ارشد،
رئیس اختر، علی احمد جلیلی، رحمٰن جامی،
فیض الحسن خیال، جوہر ہاشمی، مظفر النساء
ناز، عزیز النساء صبا، ضمیر الزماں منیر،
اور کشمیرا کرن نے کلام سنایا۔ ممتاز موسیقار
وٹھل راؤ نے دیر تک غزلیات
خسرو اپنے مخصوص انداز میں پیش
کرکے محفل کا خوشگوار اختتام کیا۔

● سالار جنگ میوزیم کی طرف سے
اس کے بانی نواب سالار جنگ کی یاد میں
کے زیر عنوان مذاکرہ منعقد ہوا۔ جناب
عابد علی خان ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر
میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ،
جناب میر معظم حسین (سابق مشیر لوکلم
نے سالار جنگ اور میوزیم کے لاثانی
ذخیرۂ نوادر پر اپنے خیالات کا اظہار
کرتے ہوئے زبردست خراج
عقیدت ادا کیا۔ ڈائرکٹر میوزیم ڈاکٹر
ایم ایل نگم نے منظوم خراج ادا کیا اور
بتایا کہ نواب صاحب کی مبسوط سوانح
میوزیم کی طرف سے مختلف زبانوں
میں شائع کی جائے گی۔ اس موقع
پر جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست
کو صحافت کا "غالب ایوارڈ" ملنے
کی مسرت میں میوزیم کی طرف سے
ڈاکٹر نگم نے گلپوشی کی۔

۱۷ر جولائی: سالار جنگ میوزیم کی
طرف سے سہ لسانی مشاعرہ جناب
نریندر لوتھر کی صدارت میں ہوا۔
سعید شہیدی، ولی قادری، صلاح الدین
نیر، اوم پرکاش نرمل، ڈاکٹر موہن لال
نگم، نیپال سنگھ ورما، رئیس اختر،
عزیز النساء صبا، کیشو چند عالم، ابو القاسم
قاسم، وقار صدیقی دہلوی، دولی چند
ششی، انور ہاشمی اور وینو گوپال
سبھاش نے کلام سنایا۔

۲۱ر جولائی: مسز آدرش مصرا،
انچارج ترقی اردو بیورو حکومت ہند
نے اندرا پریہ درشنی ڈگری کالج کی طالبات
کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ،
بیورو کا دفتر برائے جنوبی ہند حیدرآباد
میں عنقریب اپنا کام شروع کرے
گا۔ مسز مصرا نے کل ہند اردو تعلیمی
کانفرنس کے زیر نگرانی مرکز خوشنویسی
برائے طالبات کا کانفرنس کے صدر
جناب جلیل پاشاہ کے ہمراہ معائنہ
کیا۔

● ادارۂ فکر و نظر کا ادبی و شعری
اجلاس نواب میر احمد علی خاں سابق

وزیر داخلہ کی صدارت میں ہوا۔ موصوف نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت اُردو کو نظرانداز کرنے کی پالیسی پر کاربند ہے، ایسے حالات میں اُردو والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی صفوں کو متحد کرلیں۔ مشاعرہ میں لطان ارشد، جاندار افسر، نذیر علی عدیل، قادر نعیم، زور آغائی، راجہ لال راجہ، سعید فیضانی، اختر ولجد، چاند ہاشمی راہی، ضیا ساحری، خالد کشیری، رؤف رحیم اور شاہد عدیلی نے حصّہ لیا۔

۲۲ر جولائی : کارکنان روزنامہ سیاست نے جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست کو صحافت کا غالب ایوارڈ ملنے کی مسرّت میں جلسۂ تہنیت منعقد کیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ آپ نے جناب عابد اور روزنامہ سیاست کی صحافتی اور حیدرآبادی روایات کی نمائندہ پاسداری اور بے لوث اردو دوستی کو خراج تحسین ادا کیا۔ ابتداً جناب ہاشم سعید سینئر سب ایڈیٹر سیاست نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے سیاست کے ۳۵ سالہ صحافتی کردار کو اُردو صحافت کا روشن دور قرار دیا۔ مہمانانِ خصوصی مسٹر ٹی انجیا، سابق چیف منسٹر، جناب سید مکثر شاہ صدر ریاستی قانون ساز کونسل کے علاوہ مسٹر جی وینکٹ سوامی سابق وزیر نے بھی جناب عابد علی خاں اور روزنامہ سیاست کی خدمات کو سراہا۔ جناب صلاح الدین نیّر نے تہنیتی نظم سنائی۔ مشہور خوشنویس غوث محمد خان نے خطاطی کا شاہ کار نذر کیا۔

۲۶ر جولائی : مجلس شہر ادب کا ماہانہ مشاعرہ جناب سعید شہیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یوسف نظر نے نظامت کی، سعید نظر، فرید متین، خواجہ ذاکر گوڈ ر شاہی، راز عابدی، انور سلیم، سعید فیضانی، پرویز عابدی، جیلانی بیگ، صادق، رشید شہیدی، سلطان کاظمی، اسمٰعیل ظریف اور ابراہیم خلیل نے کلام سنایا۔

اگست ۱۹۸۴ء

۸ر اگسٹ : ساہتیہ اکیڈیمی دہلی کے زیر اہتمام "ہندوستانی ادب کے معمار" سلسلے کے تحت دبستانِ دکن کے آخری معلم، محقق اور دانشور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور بانیٔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی حیات اور علمی و ادبی کارناموں پر پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کی کتاب "ڈاکٹر زور" کے نام سے شائع ہوئی۔

۹ر اگسٹ : عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن، نمایش سوسائٹی اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کی طرف سے جناب پدم شری عابد علی خان، ایڈیٹر روزنامہ سیاست کو "غالب صحافتی ایوارڈ" عطا ہونے کی مسرّت میں جلسۂ تہنیت کا انعقاد عمل میں آیا۔ ریاستی وزیر فینانس مسٹر بی بھاسکر راؤ نے جناب عابد علی خاں کی خدمت میں مومنٹو پیش کیا۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ، جناب سید مکثر شاہ، صدر ریاستی قانون ساز کونسل، مسٹر پی نرسا ریڈی سابق وزیر نے سیاست اور جناب عابد علی خان کی خدمات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خراجِ تحسین

ادا کیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نذرانۂ سخن پیش کیا۔

۲۵ر اگسٹ : ہندی اور اردو کے ممتاز ادیب اور محقق پروفیسر سری رام شرما سابق صدر شعبہ ہندی عثمانیہ یونی ورسٹی کا انتقال ہوگیا۔ پروفیسر شرما ۱۶ر اگسٹ کو اسکوٹر کے حادثہ میں بے ہوش ہو گئے تھے۔ آنجہانی شرما جی کا اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں ان کی المناک وفات پر اظہار رنج و ملال کیا گیا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی محفلوں میں وہ بہ پابندی شرکت کیا کرتے تھے۔

۲۷ر اگسٹ : ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے پروفیسر سری رام شرما کی وفات پر تعزیتی بیان میں گہرے رنج و الم کا اظہار کرتے ہوئے اردو اور ہندی والوں کے لئے ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی المیہ قرار دیا۔

۳۱ر اگسٹ : ہندی، تلگو، اردو اور مرہٹی کی علمی و ادبی ایک سو انجمنوں کی طرف سے پروفیسر شرما کو ایک نمایندہ جلسۂ تعزیت میں زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جناب سید ہاشم علی اختر، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر سی ناراین ریڈی صدر نشین سرکاری زبان کمیشن، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے، مسٹر ڈی راما رنج راؤ، پروفیسر مغنی تبسم، مسٹر اوم پرکاش نرمل، جناب حمید اللہ، مسٹر سری نواس لاہوٹی اور دیگر مختلف کنڈرا سے کمپنیوں نے مخاطب کیا۔ آخر میں ایک قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

صفحہ ۲۳ کا سلسلہ ملاحظہ فرمایئے :

کرشن چندر کی افسانہ نگاری

استحصال اور فرد اور بے بسی اور مظلومیت کو ایک نئے زاویئے سے اُجاگر کیا۔ ان کے یہاں نعرہ بازی نہیں، ایک دھیما اور دل میں بیٹھ اُتر جانے والا انداز ہے۔ ان کے افسانے قاری پر بوجھ نہیں بنتے لیکن آہستگی کے ساتھ اس کو سوچ، غور فکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں خامیوں سے انکار نہیں لیکن ان کے فن میں رفعتیں بھی بے پناہ ہیں اور کون ہے جو اس سے انکار کرے کہ وہ اردو افسانے کا ایک مینارۂ نور ہیں۔



نتائج اُردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اُردو

منعقدہ مئی ۱۹۸۴ء

اُردو دانی : مرکز بھونگیر، کامیاب رول نمبر ۱، ۲ مرکز
رتبنا سرپور کامیاب رول نمبر ۳ تا ۷، ۹ تا ۱۱، ۱۴۔ مرکز
سرپور : کامیاب ۱۵ تا ۱۷، ۲۰، ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۳۰
مرکز کریم نگر کامیاب ۳۱ تا ۳۹ مرکز کوٹ گیر (بودھن)
۴۱ تا ۴۳ مرکز کھمم ۴۴ مرکز مدن پلی ۴۵ تا ۴۹۔
نظام آباد: ۵۱، نیلور ۵۳ تا ۵۵ حیدرآباد: ۵۶
۵۷، ۶۱، ۶۸ تا ۷۰، ۷۵، ۷۷ مرکز ادھونی ۷۸ تا
۸۳، ۸۵ تا ۹۵

اردو زبان دانی : بھونگیر ۲، ۳، ۶، ۸، ۹، ۱۰
مرکز رتبنا (سرپور) اول: ۱۱، ۱۷، ۴۱ تا ۴۳، ۴۵، ۴۸
۴۹، کامیاب : ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۸، ۲۰ تا ۲۴، ۳۰ تا
۳۲، ۳۴، ۳۶، ۳۸ تا ۴۰، ۴۷، مرکز سرپور، اول:
۵۴ کامیاب: ۵۵ مرکز کریم نگر اول: ۵۷ کامیاب
۵۸ کھمم، اول: ۶۴، ۶۵، ۶۸، ۷۱ کامیاب : ۶۶
۶۷، ۶۹، ۷۰ مرکز مدن پلی، کامیاب : ۷۵ مرکز
نظام آباد اول ۷۹، ۸۰، ۸۱ کامیاب: ۷۸ مرکز نیلور:
اول، ۸۵، ۸۸، کامیاب ۸۲، ۸۴، ۸۶، ۸۷ مرکز [illegible]
کامیاب ۹۱، ۹۲ مرکز حیدرآباد، اول : ۹۳، ۹۸، ۱۰۲،
۱۰۳، ۱۱۰، ۱۲۱ تا ۱۲۳ کامیاب ۹۴، ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۶ تا
۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۱۹ مرکز ادھونی اول ۱۲۵ ،
کامیاب ۱۲۴

اُردو عالم : مرکز آرمور [بھونگیر] ۱ تا ۸ درجہ دوم مرکز [بھونگیر] دوم ۹
۱۱، ۱۳، ۱۴ تا ۱۷، سوم ۱۰۔ مرکز دہلی اول: ۱۹، ۲۲
۲۹، ۳۱، ۳۶، ۴۸، ۴۹، ۵۵ دوم ۲۵، ۲۷، ۲۸
۳۳، ۳۴، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۵، ۴۷، ۵۰ تا ۵۲
۲۷۰، ۳۷۳ سوم ۲۳، ۲۴، ۲۶، ۴۱، ۴۳، ۴۴
۱۷۳۔ مرکز رتبنا (سرپور) دوم ۵۶، ۶۳، ۶۷، ۶۸،
۷۰، ۷۱، ۷۷ سوم ۵۸، ۶۱، ۶۴ تا ۶۶، ۶۹، ۷۲ تا ۷۶
۷۸ مرکز سرپور، دوم: ۸۱، ۸۴، ۸۶ تا ۸۹، ۹۱ سوم
۸۳، ۸۵، ۹۰، ۹۲، ۹۳۔ مرکز کریم نگر، اول: ۹۴، دوم
۹۶۔ مرکز کوٹ گیر (بودھن) اول: ۱۰۳ دوم ۹۷ تا
۱۰۰، ۱۰۵ تا ۱۰۷ سوم ۱۰۴ مرکز کھمم: دوم ۱۱۰، ۱۱۲،
سوم ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۷، ۱۱۹ مرکز محبوب نگر:
دوم ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۶، سوم ۱۲۰، ۱۲۳، ۱۲۵ تا ۱۲۸،

مرکز مدن پلی سوم: ۱۲۹، مرکز نارائن کھیڑ: اول ۱۴۲، دوم
۱۳۱، ۱۳۳ تا ۱۳۵، ۱۳۷ تا ۱۴۱، ۱۴۳ تا ۱۴۵، ۱۴۸، ۱۴۹،
۱۵۱، ۱۵۴، ۱۵۶ تا ۱۶۴، ۱۶۶ تا ۱۷۶، ۱۷۹، ۱۷۲ تا
۱۸۶، ۱۸۸ تا ۱۹۰، ۱۸۳ تا ۱۹۵، ۱۹۷۔ سوم: ۱۳۶،
۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۵، ۱۶۰، ۱۷۷
۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۷، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴ مرکز نظام آباد
اول: ۲۰۸ دوم ۱۹۹ تا ۲۰۵، ۱۰۸، ۲۷۴ تا ۲۷۹،
۲۸۱ تا ۲۸۳ سوم ۱۹۸، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۹۔ مرکز
نلگنڈہ، دوم: ۲۱۰، ۲۲۱، ۲۲۳، سوم ۲۱۱، ۲۱۴ تا
۲۲۰، ۲۲۲، ۲۲۴ تا ۲۳۲۔ مرکز نندیال، دوم ۲۳۳ تا
۲۳۵، ۲۴۱، ۲۴۲ سوم ۲۳۶ تا ۲۴۰۔ مرکز نیلور،
تا ۲۵۳ سوم ۲۴۶، ۲۴۷
دوم: ۲۴۴، ۲۴۸۔ مرکز حیدرآباد: اول ۲۹۶،
۳۰۵، دوم ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۸۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۲۴،
۳۲۶، ۳۲۹، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۴۳، ۳۴۵،
۳۴۷، ۳۴۸، ۳۵۴، ۳۶۴ تا ۳۶۵ سوم ۲۷۵
تا ۲۷۷، ۲۸۳، ۲۸۶، ۲۹۱، ۲۹۲، ۳۰۰، ۳۱۸،
۳۲۵، ۳۳۰، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۶۶ تا ۳۶۸ ہیچ
اردو فاضل: مرکز آرمور، درجہ دوم ۴، ۹، ۱۰،
درجہ سوم ۱ تا ۳، ۵ تا ۸، ۱۱، ۱۲ مرکز بھونگیر، دوم:
۱۹، ۲۱، ۲۳ تا ۲۶، ۲۹، ۳۰، ۳۲، سوم ۱۳ تا ۱۸،
۲۰، ۲۸، ۳۱ مرکز پربھنی دوم: ۳۳ تا ۳۶، ۴۰، ۴۲
۴۴، ۵۰، ۶۱ سوم ۲۷، ۳۸، ۴۳، ۴۶، ۴۷ تا ۴۹،
۵۳ تا ۵۶، ۵۸ تا ۶۰، ۶۳۔ مرکز ریناد (سرپور):
دوم، ۷۰، ۷۲، ۷۳ سوم ۶۸، ۶۹، ۷۱، ۷۴ تا ۷۶
مرکز سرلپید دوم ۸۰، ۸۱، سوم ۷۸، ۷۹، ۸۲، ۸۳،

مرکز کریم نگر، دوم: ۸۷، ۸۹، ۹۱، ۹۲ سوم ۸۵، ۸۶،
۹۰، ۹۳ مرکز کوٹ گیر (بلودھن) دوم ۹۵، ۹۷، ۹۸
سوم ۹۴، ۹۶، ۹۹۔ مرکز کھمم: سوم ۱۰۱ تا ۱۰۹، ۱۱۱
تا ۱۲۲، مرکز محبوب نگر دوم ۱۲۳، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۴،
۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۰، سوم:
۱۲۵ تا ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۴۰،
۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵ تا ۱۴۸ تکمیل گروپ II ۱۳۱، تکمیل
گروپ II، III ۱۵۱۔ مرکز مدن پلی سوم ۱۵۲، ۱۵۵،
۱۵۷ تکمیل گروپ III ۱۵۸ مرکز نظام آباد، اول ۱۵۹، دوم
۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۵، تا ۱۶۶، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۳، سوم:
۱۶۲ تا ۱۶۴، ۲۶۱، ۲۶۴، ۲۶۵ مرکز نلگنڈہ، دوم:
۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۱ تا ۱۷۳، ۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۴،
سوم: ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۵ تا ۱۷۷، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۵۹،
تکمیل گروپ: II، III ۱۷۴، ۱۸۵۔ مرکز نندیال، دوم
۱۸۹، ۱۹۱، ۱۹۲، سوم ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۳ تا
۱۹۵ تکمیل گروپ I، II ۲۵۶ تا ۲۵۸۔ مرکز نیلور،
درجہ سوم ۱۹۶ تا ۱۹۸ مرکز حیدرآباد سٹی کالج، دوم:
۲۱۰، ۲۲۷، ۲۳۹ تا ۲۴۱، ۲۵۴ سوم ۲۰۷، ۲۰۸،
۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۸ تا ۲۲۱، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۶، ۲۴۰،
۲۴۳ تا ۲۴۴، ۲۴۶، ۱۵۱، ۱۵۲، کامیاب گروپ،
I، II ۲۲۸ گروپ II، III ۲۳۴، ۲۴۷،
۲۴۸، ۲۵۰، ۲۵۳، تکمیل گروپ II ۲۲۹۔

ڈاکٹر مرزا اکبر علی بیگ
(کارگذار معتمد اعزازی شعبۂ امتحانات)

SEPTEMBER 1984

R N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد

بالِ جبریل



ضربِ کلیم

مکاتیبِ رشید

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.

سب رس



بیادگارِ ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زور

جلد ۴۴، شمارہ ۱۰، سن اجرار ۱۹۳۸ء

فون : ۳۸۴۶۹

اکتوبر ۱۹۸۴ء

سب رس

ماہ نامہ — حیدرآباد

قیمت : ۲ روپے ۵۰ پیسے

زرِ سالانہ : ۳۰ روپے، کتب خانوں سے : ۳۵ روپے

بذریعہ رجسٹری : ۴۵ روپے

بیرونی ملکوں سے :

ہوائی ڈاک سے :		بحری ڈاک سے :
مشرقِ وسطیٰ	۱۵ ڈالر	۶ ڈالر
امریکہ	۲۰ ڈالر	۷ ڈالر
پاکستان، برما، سیلون	۱۰ ڈالر	۴ ڈالر
انگلستان	۸ پونڈ	۳½ پونڈ

رمن راج سکسینہ، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان میں چھپوا کر، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

کتابت : رضی الدین اقبال

ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو

پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد۔ 500482.

سرورق : مُلّا ہاشمی بیجاپوری

ترتیب



اپنی بات

پنڈت جواہر لال نہرو نے ہماری قوم کو "آرام حرام ہے" کا نعرہ دیا تھا۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہ تھا کہ ہندوستان کی بقا، ترقی اور اقوامِ عالم میں باعزت اور باوقار مقام و مرتبہ کے حصول کے لیے سخت محنت اور مسلسل جدو جہد کی شدید ضرورت ہے۔

آج اُردو والے اپنی زندگی کے ایک اہم اور اعلیٰ مقصد کو پانے کے لیے اسی نعرہ کو پیشِ نظر رکھیں اور صبر و سکون اور پُرخلوص جذبہ کے ساتھ ہندوستان میں اُردو کی بقا و ترقی کے لیے ہمہ تن مصروف ہو جائیں تو ہماری زندگی کے اس آزمائشی دَور میں بھی ہم بلاشبہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔

ا بھد: ۔ کی روح

اس کے روشن و تابناک مرقعے ہیں۔ ہمارے ادب میں ہندوستان کے دل کی دھڑکنیں محفوظ ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک آزادی کی مسلسل جدوجہد میں بھی اُردو کا شاندار حصہ رہا ہے۔ اس وقت، ہماری زبان کو پُرخلوص خدمت کا جذبہ رکھنے والے، خاموش، مستقل مزاج، سنجیدہ لیکن سرگرم خدمت گزاروں کی ضرورت ہے۔ اگر فعّال افراد، انجمنیں اور ادارے 'اُردو کی لازمی تعلیم' بنیادی اُردو تعلیم اور بالغوں کے لیے بِلا فیس یعنی مفت اُردو کی تعلیم کے بندوبست جیسے اہم مسائل پر فوری متوجہ ہوں تو نئی نسل

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر دیکھیے)

سلیمان اطہر جاوید

قومی یکجہتی کے فروغ میں

شعرائے جامعہ عثمانیہ کا حصہ

اُردو قومی یکجہتی کا خواب بھی ہے اور خواب کی تعبیر بھی! اگر ہمارے ملک کے ارباب بست و کشاد اس ملک میں جمہوریت کو واقعی کامیابی سے ہمکنار کرنا اور سدا ترقی کی شاہراہ پر گامزن رکھنا چاہتے ہیں تو اُردو کو اس کا حق دینا ہوگا "اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں اور پھر اُردو کو علمی و ادبی اور سنجیدہ و شائستہ سطح سے ہم آہنگ کرنے کا جہاں تک تعلق ہے، کون ہے جو جامعہ عثمانیہ کے کردار سے انحراف کرے گا؟ یوں اُردو اور جامعہ عثمانیہ کا قومی یکجہتی سے رشتہ مضبوط اور محکم ہو جاتا ہے ——— یہ کہا جا سکتا ہے کہ قومی یکجہتی کے فروغ میں اُردو شاعروں کے کردار کا جائزہ لینے کی بجائے اس موضوع کو صرف جامعہ عثمانیہ کے شاعروں تک کیوں محدود کیا جائے؟ یہ بات بلاشبہ عثمانیہ یونیورسٹی کے آج کے موقف کے بارے میں درست ہے کہ آج عثمانیہ یونیورسٹی کی حیثیت ملک کی بیشتر یونیورسٹیوں کی طرح ہے لیکن جامعہ عثمانیہ کہتے ہوئے ہم ایک عظیم تعلیمی ادارے کے ایک مخصوص دور اور ایک مخصوص کردار سے مُراد لیتے ہیں۔ وہ دور اور وہ کردار جو اُردو کے حق میں آج بھی باعث سربلندی و وجہ افتخار ہے۔

آج ہم قومی یکجہتی کی باتیں جس پس منظر میں، جس حکمتِ عملی کے تحت اور جن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرتے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس کی کامیاب مثال سلطنتِ آصفیہ اور جامعہ عثمانیہ نے عرصہ قبل پیش کر دی تھی۔ سلطنتِ آصفیہ تین علیحدہ زبانوں کے علاقوں تلنگانہ، کرناٹک اور مرہٹواڑہ

پر مشتمل تھی۔ ملک کی لسانی بنیادوں پر تنظیم جدید کے نتیجے میں یہ علاقے اپنی اپنی زبان کی ریاستوں میں شامل کر دیئے گئے ہوں لیکن سابق ریاست حیدرآباد میں یہ سب مل کر ایک لسانی اکائی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اردو ان علاقوں میں مشترکہ زبان ہی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ ان میں قومی یکجہتی کی ایک علامت بھی تھی۔ سیاسی حالات نے آگے چل کر جو بھی کروٹ لی ہو، تاریخ شاہد ہے کہ ریاست حیدرآباد اپنی اس علاقائی لسانی رنگارنگی کے باوجود قومی یکجہتی کا روشن باب رہی۔

ان پیچ و خم میں قومی یکجہتی کے فروغ میں جامعہ عثمانیہ کے شاعروں کا کردار ایک مینارۂ نور بن جاتا ہے اس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ سقوط سلطنت آصفیہ سے قبل حیدرآباد، بقول فانی، ہندوستان میں رہتے ہوئے ہندوستان سے دور تھا۔ ریاست حیدرآباد کی اپنی اس جداگانہ امتیازی اور انفرادی وحدت اور اپنی اس شناخت کی برقراری کے سبب بھی جامعہ عثمانیہ کا کردار، عثمانیہ یونیورسٹی سے باآسانی ممیز کیا جاسکتا ہے۔

بحیثیت ریاست کے اپنے جداگانہ موقف اور سیاسی اکائی کے بطور اپنے انفرادی مقام کے پس منظر میں یہاں کے سیاسی اور مذہبی قائدین اور ارباب اقتدار کے جو بھی جذبات و محسوسات ہوں، ادیبوں اور شاعروں نے اس ڈھانچے میں رہنے کے باوجود اپنی دنیا آپ بسائی انہوں نے اردو سے اپنی جذباتی وابستگی کو ہر قیمت پر برقرار رکھا لیکن دیگر زبانوں سے بے تعلقی بھی نہیں برتی۔ ان زبانوں کے الفاظ، محاورات اور تلمیحات وغیرہ کو اپنے کلام میں استعمال کیا اور اسی کے ساتھ حیدرآباد میں رہتے ہر حیدرآباد سے دور نہیں رہتے ــــــــــ برطانوی سامراج کے خلاف قومی تحریکات کا ساتھ دیا، قومی ورثے کی پاسداری کی، عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی۔ ان کے حوصلوں اور امنگوں کو نیا موڑ دیا، خواہ وہ ہندو ہوں کہ مسلمان، ان شاعروں نے دوسرے مذاہب اور معتقدات کا احترام کیا۔ احترام ہی نہیں، دیگر مذاہب کے پیشواؤں کے کردار اور ان کی خدمات کو سراہا اور ایک صالح معاشرے کے قیام کے لئے ان کی تعلیمات کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ قومی یکجہتی کے فروغ میں شعرائے جامعہ عثمانیہ کا یہ کردار بھی لائق ستائش ہے کہ انہوں نے کسی ایک علاقے، وہاں کے موسموں، دریاؤں، پہاڑوں، مقامات، پھلوں اور پھولوں وغیرہ ہی کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا اور اپنے اشعار میں صرف ان ہی کے حوالے نہیں دیئے بلکہ ہندوستان کے اس وسیع و عریض علاقے، یہاں کی پہنائیوں، جھلکتی فضاؤں، جھلکتے موسموں اور جھومتی بدلیوں اور یہاں کے سورماؤں اور ویروں سے بھی ویسی ہی چاہت اور

جذباتی تعلق کا اظہار کیا۔ انہوں نے کسی بھی تفریق اور تعلق کو ہوا نہیں دی اور جیسا کہ سچے ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کا خاصہ رہا ہے، نسلی، مذہبی، علاقائی اور ذات پات کے تمام رجحانات سے ماورا ہو کر جامعہ عثمانیہ کے شاعروں نے قومی جذبات کے فروغ، انسان دوستی اور انسانیت پرستی کو اپنا شعار بنایا۔ ان کے کلام میں دکن کی مٹی کی خوشبو یقیناً ہے اور سارے ملک سے لگاؤ بھی بے اختیارانہ ملتا ہے۔

قومی یکجہتی کے سلسلے میں زبان کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہوں، کوئی زبان والے نہ صرف یہ کہ اپنی زبان کو سادہ، عام فہم اور آسان بنا کر بلکہ دیگر زبانوں کے سلیس الفاظ کو اپنا کر ان زبان والوں سے قریب ہو سکتے اور ان کا دل جیت سکتے ہیں، دیگر زبان والوں میں ایسے افراد ہیں لیکن معروضی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے بھی بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو والوں میں ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ شعرائے جامعہ عثمانیہ نے اس دور میں جب کہ اردو کی ترویج و اشاعت کی مساعی غیر معمولی سطح پر جاری تھیں، ہندی کے زیادہ اور کہیں کہیں ٹھیٹ دکنی اور تلگو الفاظ کے استعمال سے ایک اپنائیت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کی اور قومی یکجہتی کے لئے حالات کو اپنے طور پر سازگار کیا۔ اکبر وفاقانی اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ اُن کی نظم "بنایل اور شام" کا پہلا شعر ہے ؎

شام کی سُندر فضا میں دور کی تنویر ہے
خواب دوشیزہ کی میرے سامنے تصویر ہے

اسی طرح ان کی نظم "سندر شام" میں خاص طور پر ہندی الفاظ کا اہتمام ملتا ہے۔

محمد عبد القیوم خان باقی کی نظم "بانسری" کا انداز ہی اور ہے۔ ہندی الفاظ کا استعمال باقی نے خاصا کیا ہے "بانسری" کا صرف ایک بند پیش کرتا ہوں۔

میرے دھن سے دنیا جاگے   تمہیں من میں غم کے دھاگے
میرے کومل راگ کی لہریں   جیسے من میں بہ نا بھاگے

لیکن اس دور کے جس شاعر نے ہندی الفاظ اور تراکیب وغیرہ کا استعمال بہت زیادہ کیا ہے وہ بلاشبہ اختر عادل ہیں۔ انہوں نے ہندی الفاظ اور بحروں کی غنائیت سے پورا پورا استفادہ کیا اور گیت بھی لکھے۔ ان کے مزاج کی آئینہ داری ان کے شعری مجموعہ کے عنوان "کلپنا" سے بھی ہوتی ہے۔ سلیمان اریب نے اختر عادل کے بارے میں "حیدرآباد کے شاعر" (جلد دوم) میں لکھا ہے:

"وہ ہندی گیتوں میں نغمگی پیدا کرنے کے لئے نہ صرف یہ کہ ہندی بحریں
ہی استعمال کرتے ہیں بلکہ ہندی اور برج بھاشا کے الفاظ بھی بڑی
برجستگی سے برتتے ہیں۔ گیتوں کے علاوہ اختر کی نظموں اور
غزلوں کی زبان بھی بہت میٹھی اور کومل ہوتی ہے۔ اختر ان شاعروں
میں سے ہیں جنھوں نے اردو کو ہندی سے قریب لانے کی
شعوری کوشش کی ہے۔"

اختر عادل کی قابلِ ذکر منظومات میں "سپنوں کی سندری"، "ہنکار"، "بھید کھلا نہ گلشن کا"،
اور "اکال گیت" کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ میں یہاں ان کی ایک مختصر سی نظم "بھید کھلا نہ گلشن کا"
پیش کرتا ہوں، اندازہ ہوگا ؎

دھرتی نے ساون بھادوں میں دیر تلک اسنان کیا
لجا لجا کر سمٹ سمٹ کر اپنے روپ کا دھیان کیا
ہرے ہرے گل بوٹے والے وستر پہنے، باغ بنی
اتنی پیاری اتنی سندر کوئی نہیں تھی روپ دھنی
گال کے لال گلاب نکھاوٹ، دیر تلک سنگار کیا
اپنے روپ کے درشن کو وہ پھول بنی پھر نرگس کا
آنکھ کھلی نرگس کی لیکن روپ دکھا نہ گلشن کا
بھید کھلا نہ گلشن کا

اور ایسے کئی شاعروں اور منظومات میں شنکر موہن لال رواں کی نظم "ایک ہندی عورت
عالم خیال میں"، سید علی محسن زیبائی "پپیہا اور صورت"، کاوش حیدرآبادی کی "بجارن"، غفور انیس کی
"اجیارا [illegible]" ابوظفر عبدالواحد کی منظومات "بادل" اور "پپیہا" اور صاحبزادہ میکش کی
"اسنان" چند ایک ہیں۔ ہندی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے قومی یک جہتی کے فروغ کے لئے
[illegible] کو سازگار بنانے کی روایت جامعہ عثمانیہ کی نئی نسل کو بھی ملی ہے۔ آج کے کئی شاعروں کے ہاں
یہ رجحان بھرپور اور توانا انداز میں ملتا ہے۔ شاذ تمکنت کے ہاں بھی، جس نے فارسی کے خوش صوت
بھرپور اور نکھرے الفاظ کے استعمال سے اپنے کلام میں بانکپن پیدا کیا ہے، ہندی الفاظ سے
طرحداری پیدا ہوتی ہے۔ "نیندی وادی" میں "اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو"، "کو ٹلیا مت کر پکار"

ــــــــــ شاذ کے ہاں ایسی اور کئی منظومات بن جائیں گی۔

دیگر مذاہب اور معتقدات کے احترام کا جہاں تک تعلق ہے، شعرائے جامعہ عثمانیہ نے صدقِ دل سے کام لیا اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ دیگر مذاہب اور فلسفوں کی اچھی اقدار کی ترویج میں حصہ لیا کہ یہی اصلِ انسانیت اور روحِ مذاہب ہے۔ ابوالفتح محمد نصراللہ باقی نے شعرگوئی کی سمت کم کم ہی توجہ دی لیکن ان کے موضوعات میں نیاپن ہے، لطافتِ خیال نے ان کے کلام میں ایک نیا رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اُن کی ایک طویل نظم ہے "فلسفیوں کی محفل" ــــ اس میں "ویدانتی کا فلسفہ" کے تحت اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو ـــ

کچھ پوچھ نہ اے دوست کہ کیا راز ہے عالم　　اک خوابِ مسلسل ہے نظر آئے جو پیہم

تصویرِ خیالی ہے جو کچھ دیکھتے ہیں ہم　　یا عکسِ تصور ہے کہ جو ہو درہم و برہم

ہم دیکھتے ہیں اپنے تصور کے اثر کو

یہ اصل حقیقت ہے کہ دھوکا ہے نظر کو

تاریخی اور تہذیبی ورثے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور اس سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے بھی فن کار اپنے فن کی تزئین کرتا اور اس کو معتبر اور وزن و وقار کا حامل بناتا ہے۔ تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہی موجودہ نسل کے لئے وجہِ خوداعتمادی، مشعلِ راہ اور آنے والی نسلوں کے لئے شمعِ ہدایت بن جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تہذیبی بحران اور قومی سطح پر انتشار کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ عوام اور عوام سے زیادہ ان کے قایدین، تاریخی اور تہذیبی ورثے سے بے بہرہ ہو چکے ہیں۔ ان عظیم ہستیوں کو فراموش کیا جا چکا ہے، جنھوں نے ماضی میں ہماری تاریخ کو نیا رنگ دیا، ہماری تہذیب کو اجالا اور اپنی حیات کو ملک و قوم کے کام میں لایا۔ اس سلسلے میں جلال الدین اشک کی نظم "رضیہ سلطانہ میدانِ جنگ میں" خاصی توجہ کی حامل ہے۔ اکبر وفاقانی کے پاس ایسی کئی منظومات ملتی ہیں، جن میں "ساغرِ جہانگیر" اور "ٹیپو سلطان سے اہلِ ہند کا خطاب" اہمیت کے حامل ہیں۔ "ٹیپو سلطان سے اہلِ ہند کا خطاب" کے دو تین بند ـــ

اے پیکرِ آزادی اے روحِ شجاعت آ　　اے قلبِ محبت آ اے جانِ حمیت آ!!

ایثار و صداقت پر کی جان فدا تو نے　　دکھلا دے اسیروں کو اجڑی ہوئی شوکت آ

قائم ہے ترے دم سے اندازِ جہاں بانی

باقی تھی ترے بل پر حریتِ انسانی

ٹیپو تری ہستی پہ نازاں ہے وطن اب تک — اور تیری شہادت پہ نالاں ہے وطن اب تک

عقل تری ہستی ... اور جان عمل گم ہے — اس جان نہ ہونے سے بے جان ہے وطن اب تک

آنکھوں میں جھلک جاؤ آنسو سے ٹپک جاؤ

لعنت کی انی بن کر ہر دل میں کھٹک جاؤ

وہ بھی کوئی ملا تھا جو طور پہ رہ جاتا — یا شیخ کا تقویٰ تھا جو حور پہ رہ جاتا

جو ... مسلم کو یقین حاصل تھا — کس طرح یہ ممکن تھا میسور پہ رہ جاتا

دنیا بھی ملی جس کو عقبیٰ کی حکومت بھی

اس دار میں حاصل کی شہرت بھی شہادت بھی

... نے اپنی معرکۃ الآرا منظومات "اجنتا" اور "ایلورہ" تخلیق کر کے یہ ثابت کر دیا کہ فن کار ... کا شدید ... تاریخی ورثے کا احترام کرتا ہے اپنے تہذیبی اثاثے ... ہے اور ... میں نہ مذہب مانع ہوتا ہے اور نہ عقیدہ۔

حیدرآباد کی اپنی جداگانہ سیاسی وحدت کے باوصف شعرائے جامعہ عثمانیہ نے ہندوستان ... طور پر اپنے تعلق کو برقرار رکھا۔ اس دور کے حالات کو ملحوظ رکھئے یہ بہت بڑی بات تھی ... شاعروں کے ہاں ہندوستان سے ذہنی بلکہ جذباتی وابستگی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ انہوں ... ہندوستان کے شاندار اور قابل فخر ماضی کے گیت گائے۔ یہاں کے ذرے ذرے کو سراہا۔ یہاں کے ... کو سراہا۔ یہاں کے موسم کی تحسین اور یہاں کی سونا اگلتی زمین کی تعریف میں اپنے قلم سے پھول ... تو الحسن نسیم ایک ایسے ہی شاعر ہیں جن کے بیشتر اشعار سے ہندوستان سے ... کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے۔ "مادر ہند" ان کی ایک ایسی ہی نظم ہے۔ ہندوستان کی کیسی دلنواز ... آتی ہے یہ اشعار سے

روکش ہیں رخ ہی کو غنچہ ... ہے یہی — چشم اغیار میں آئینہ حیرت ہے یہی

... کی ... ہے یہاں — ہے یہ مشہور زمیں سونا اگلتی ہے یہاں

... فرشتے بھی ہیں ذروں کا تماشا کر کے — پھینک دیتے ہیں یہاں چاند کو چورا کر کے

ظاہری آنکھ ... ہیں ... کے جلوے — پتھروں میں نظر آتے ہیں خدا کے جلوے

... لطف ہے ہر سانس میں سنتے ہیں رباب — دل کے پیمانے میں ملتی ہے حقیقت کی شراب

مخدوم محی الدین جیسے انقلابی نے قومی آزادی کی جد و جہد کو "یہ جنگ ہے جنگ آزادی" جیسا حوصلوں

نوابھارنے، اُمنگوں کو نکھارنے، دلوں کو بڑھانے اور قلب کو گرمانے والا گیت دیا۔ ہندوستان کی جے جے کار کے نعرے بھی لگے۔ مخدوم کی نظم "ہندوستان کی جے" ایک پُربہار نظم ہے جس میں مخدوم نے ہندوستانی نوجوانوں کو سراہا اور ان کے عزائم اور حوصلوں کی داد دی ہے اور ایں و آں اور من و تو کا لحاظ کئے بغیر قوم کو یکجہت اور یک جسد کر دیا ہے۔ کیسے خون میں حدت اور جذبات میں شدت پیدا کرنے والے اشعار ہیں ؎

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

وہ ہندی نوجواں یعنی علمبردارِ آزادی | وطن کا پاسباں وہ تیغِ جوہر دارِ آزادی
وہ پاکیزہ شرارہ بجلیوں نے جس کو دھویا ہے | وہ انگارہ کہ جس میں زیست نے خود کو سمویا ہے
بدل دی نوجوانانِ ہند نے تقدیر زنداں کی | مجاہد کی نظر سے کٹ گئی زنجیر زنداں کی

کہو ہندوستاں کی جے
کہو ہندوستاں کی جے

مخدوم نے آزادی کی مہم کو تیز تر کرنے کے لئے گیت ہی نہیں لکھے، انہوں نے ہندی نوجوانوں کی ستایش کرتے ہوئے ان کو نئی راہوں پر گامزن ہونے کی ترغیب ہی نہیں دی بلکہ کبھی طنز اور برہمی سے بھی کام لیا اور ہندوستانیوں کے سامنے ہندوستان کی صحیح تصویر پیش کر دی۔ یہ بھی ایک رویہ تھا حقیقت جہاں کو بے نقاب کرتے ہوئے قوم کو بیدار کرنے اور اس کو برطانوی سامراج کے خلاف متحد اور محکم کرنے کا۔ یوں لگتا ہے شاعر نے دل کی روح کو چھیڑتے ہوئے ہمارے دل، ہماری روح کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ مخدوم کی نظم "مشرق" کے چند شعر ہیں ؎

جہل، فاقہ، بھیک، بیماری، نجاست کا مکاں | بندگی، تاریکی، عقل و فراست کا دھواں
نیستی کی لاش سے گور و کفن میں ٹھٹھری ہوئی | مغربی چیلوں کا لقمہ، خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں | اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کوئی نہیں
پیکرِ ماضی کا اک بے رنگ اور بے روح خول | ایک مرگِ بے قیامت، ایک بے آواز ڈھول

اس زمینِ موت پروردہ کو ڈھایا جائے گا
اک نئی دنیا، نیا آدم بنایا جائے گا

اور ادھر صاحبزادہ میکش نے لگ بھگ انہی جذبات و احساسات کے ساتھ ہندوستان کی پستی و

افلاس پر آنسو بہاے۔ میکش کی نظم کا عنوان ہے "ہندوستان" اور اس کے دو بند ہیں ؎

خار و خس کی جھونپڑی، مٹی کے بوسیدہ مکاں — جیسے اندھوں کے اشارے، جیسے گونگوں کی زباں
جس طرح اُترے ہوے چہرے پہ آنسو کے نشاں — جس طرح سوکھی ہوئی ٹہنی پہ اجڑے آشیاں

داغ، جن کے ساز و ساماں، درد جن کا پاسباں
کیا اسی دنیا میں تو بستا ہے اے ہندوستاں

موت کی پرچھائیوں میں پلنے والی زندگی! — آندھیوں سے تھما کر چلنے والی زندگی!
ظلمتوں میں اپنی آنکھیں ملنے والی زندگی! — تھام کر لغزش کا دامن چلنے والی زندگی!

غم کے سانچے میں مسلسل ڈھلنے والی زندگی!
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں اے ہندوستاں!

اس دور کے تقاضے ہی کچھ اور تھے۔ ہندوستان کے اور علاقوں اور وہاں کے عوام ہی نہیں، دیسی ریاستوں اور رجواڑوں کے لوگ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ان کے افلاس، پستی اور تنگ دستی کا بڑا اور بنیادی سبب برطانوی سامراج ہے جو ہندوستان کا خون چوس رہا ہے، ہندوستانیوں کی صلاحیتوں کو سلب کر رہا ہے اور اس کو بے آبرو اور بے وسیلہ کر رہا ہے اور مزید کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستانیوں کی نگاہوں سے خواہ وہ کسی دیسی ریاست میں کیوں نہ رہتے ہوں، انگریزوں کا یہ کردار پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ انگریزوں کے ظلم و استبداد سے پوری طرح باخبر تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ہندوستان میں قومی یکجہتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ برطانوی راج ہے۔ انگریزوں کی سازشیں اور ان کی بہیمیت یہاں قومی سطح پر بھی جاری تھی اور وہاں بین الاقوامی سطح پر بھی۔ جلیان والا باغ کی قیامتِ صغریٰ کو کون ہندوستانی فراموش کر سکتا ہے۔ ایسا ممکن بھی کہاں اور کیسے؟ عزیز قیسی نے جن کی شاعری یوں بھی احتجاجی لب و لہجہ کی حامل ہے، جلیان والا باغ کے سانحے پر اظہارِ خیال کرتے ہوے گویا سارے ہندوستانیوں کے احتجاجی جذبات کو سمیٹ لیا ہے۔ انگریزوں کے اس شر میں خیر کا یہ پہلو نکلتا ہے کہ ہندوستانیوں نے اپنے اختلافات کو فراموش کیا اور ان میں یکجہتی کے جذبات فروغ پاے۔ عزیز قیسی کی نظم "جلیان والا باغ" کے یہ چند شعر ؎

اے زمینِ اجرشی آغوش کا غم نہ کر — ان جواں مرگ ویروں کا ماتم نہ کر
تیرے بیٹے مقدس، امر، جاوداں! — لکھ رہے ہیں نئے دور کی داستاں
گیت لٹتے ہیں گھٹتے نہیں، مرتے نہیں — یہ فنا کا افق پار کرتے نہیں

ہم تو کیا قاتلوں کو بھی ہے یہ پتا　　قتل ہوتے نہیں گیت، سورج، صبا
خون کی بوند، یاں ڈوبتی ہے مگر　　بیج کی طرح اٹھتی ہے پھر جاگ کر
پھر رخ پر گو اندھیرے کی تحریر ہے
رات خود اپنی قسمت کی نخچیر ہے

ہمارے شاعروں نے قومی نہیں، بین قومی سطح پر بھی انگریزوں کی بربریت کو نظر میں رکھا، اور اس کو طشت ازبام کرتے ہوئے جہاں اپنی بالغ نظری اور پختہ سیاسی شعور کا ثبوت دیا، اپنے ہموطنوں کو انگریزوں کی فطرت سے آشنا بھی کرایا تاکہ وہ سامراج کے حقیقی چہرے کو دیکھیں اور اس کے خلاف ایک جان ہو جائیں۔ محمد صفوی ساز کی نظم "ایشیا" کے مطالعے سے شاعروں کے ان جذبات کا اندازہ ہوگا۔ ساز نے "ایشیا" اس وقت لکھی، جب کہ انڈونیشیا کی جنگ آزادی اپنے شباب پر تھی لیکن یہ نظم صرف انڈونیشیا نہیں، سارے ایشیا بلکہ کل مشرق کی آزادی کی تحریکات کا اشاریہ ہے اور صرف ہندوستانیوں کے نہیں، سارے مشرق کے عوامی جذبات کی ترجمان! جذبات کا کیسا والہانہ اظہار ملتا ہے۔ کیسی وارفتگی ہے ۔

شکر صد شکر کہ مشرق کی زمیں جاگ اٹھی!　　حکمتِ مغربِ چالاک نے دم توڑ دیا
جس کی دالستہ شب و روز پرستش کی تھی　　ہم نے خود اپنے ہی ہاتھوں وہ صنم توڑ دیا

اے ولندیزیو! شمشیر کی نوکوں سے کہیں　　روحِ آزادیٔ جمہور بھی ہوتی ہے غلام
روک سکتا ہے بھلا کیا خس و خاشاک کا بند　　ایک بپھرے ہوئے چڑھتے ہوئے دریا کا خرام

خون میں ڈوب گئی چین کی دیوارِ عظیم　　ویٹ نام اور ملایا کے جواں جاگ اٹھے
وقت خود جس کے تھپیڑوں میں بہا جاتا ہو　　کس کی طاقت ہے جو اس سیلِ رواں کو روکے

ایشیا! اب وہ ترا دوست وہ پیارا مغرب　　خام اشیاء کا خریدار نہیں آئے گا
ایک معصوم تمدن کا پیامی بن کر　　تیری عظمت کا پرستار نہیں آئے گا

قمر ساحری کی نظم "اینگلو امریکن بلاک" بھی اسی سلسلے میں پڑھی جانی چاہیئے۔ قمر ساحری نے

مشرق کے خلاف مغربی ممالک کی سازشوں کو کماحقہ محسوس کیا اور اپنے ہموطنوں کے سامنے مغرب کے جبر و استبداد کا پردہ چاک کیا کہ وہ مغرب کی بدنہادی کا اندازہ کریں اور اُن کے خلاف اپنے وسائل اور مساعی کو مجتمع کرتے ہوئے سینہ سپر ہوں۔ طنز میں ڈوبے ہوئے لب و لہجہ نے اس نظم کو ایک اچھوتے رنگ کا حامل بنادیا ہے۔ نظم " اینگلو۔ امریکن بلاک " کے دو بند ہیں ؎

چند مشہور دماغوں کی سیاسی محفل　　جس میں احساس تخیل ہے، عمل کچھ بھی نہیں
آفتابوں کی شعاعوں پہ حکومت ہے مگر　　ظلمت شب کو مٹا دینے کا حل کچھ بھی نہیں

٭ ٭ ٭

یہی آزادیٔ انساں کے پرستار دماغ　　فکر میں ہیں کہ کریں سب پہ حکومت کیونکر
جوہری بم کو چھپاتے ہوئے سینوں میں بھی　　سوچتے ہیں کہ کریں امن کی خدمت کیونکر

یہ سب بجا اور درست ———— لیکن قومی یکجہتی کی مساعی کی راہ میں جو چیز سب سے زیادہ باعث زیاں اور خود قومی یکجہتی پر کاری ضرب رہی وہ فرقہ واریت تھی، خواہ ہندوؤں میں ہو کہ مسلمانوں میں! اس فرقہ واریت اور اس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ فسادات نے ہندوستان کے نقشے کو مسخ کردیا، جس کی ذمہ داری ہم لاکھ انگریزوں پر عائد کریں، اپنے آپ کو بھی بری الذمہ قرار دے نہیں سکتے۔ آخر ہم کو بھی عقل و فہم سے کام لینا، اطراف و ماحول پر نظر رکھنا اور اپنے مسائل کا جائزہ لینا تھا ———— ہم نے ایسا نہیں کیا اور انگریزوں کی سازشوں کا شکار نہیں ہونا تھا، شکار ہوگئے اور پھر خود غرض، مفاد پرست اور بدنہاد سیاستدانوں نے اپنے شخصی مفادات کے حصول، اپنی قیادت کی دوکان کو چمکانے اور اپنی روٹی روزگار کے لیے عوامی جذبات کا استحصال کیا۔ ہمارے شاعروں نے جب بھی اس کو محسوس کیا، اپنے وجود کو گویا پارہ پارہ پایا کہ یہ چیز اور جو بھی ہو، قومی یکجہتی پر کاری ضرب تھی۔ فضل الرحمٰن نے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی ہے لیکن اُن کا کلام بھی اُن کے دردمند دل کی آواز ہے۔ اپنی نظم " پریم پجاری " میں کہتے ہیں ؎

یہ دین و دھرم کے جھگڑے کیا　　یہ دیر و حرم کے جھگڑے کیا
ناقوس و اذاں کی آوازیں　　اک ساتھ ملانے آیا ہوں

جگ پیار سکھانے آیا ہوں
سنسار سجانے آیا ہوں

سرور ڈنڈا، دکنی، قدیم اردو کے نامور شاعر ہیں۔ انہوں نے انتہائی بے تکلفی کے ساتھ "تلگو الفاظ

اور لب و لہجہ کا استعمال کیا ہے۔ ان کی بعض منظومات معرکۃ الآرا ہیں۔ ہنسی ہنسی میں انہوں نے معاشرتی اور قومی موضوعات پر بڑے سے پتے کی باتیں کہدی ہیں' دلوں کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے فرقہ واریت پر بھی ڈنڈا نے اپنی کئی منظومات میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ کہیں ظریفانہ انداز میں' کہیں طنزیہ لہجے میں اور کہیں یونہی ———— " ادے ناما دیشم " (کیا یہی میرا دیش ہے ؟) ڈنڈا کی چند معروف ترین منظومات میں شمار ہوتی ہے۔ فرقہ وارانہ مسائل پر یہ ایک بند ہے

بڑا پاپ ہے یاں کو ہنسنا ہنسانا
سداں ریتے ہے یاں کی رونا رُلانا
چپ اپنے لڑکو مر ریئں گھر و دیسلیشم
ادے ناما دیشم ' ادے ناما دیشم

فرقہ واریت' ہندو مسلم مسائل اور قومی یکجہتی کا ذکر ہو تو گاندھی جی کا نام آہی جاتا ہے۔ قومی یکجہتی کا اُن سے بڑھ کر مظہر ہمارے ملک میں اور کون ہو سکتا ہے۔ سانحہ یہ ہے کہ گاندھی جی انہی مسائل کے حصول کی جدوجہد کرتے ہوئے قتل ہوئے۔ اُن کا قاتل گوڈسے نہیں' ہر وہ ہندوستانی ہے' ہر وہ فرد ہے' جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی' ہندو۔ مسلم اتحاد' اور قومی یکجہتی کا مخالف ہے' اس کی راہ میں مانع ہے۔ گاندھی جی کے قتل پر ہمارے شاعروں نے جس قدر رنج کیا' جس قدر خون کے آنسو بہائے اور ماتم کیا کہ ارضِ ہند پر ہندو۔ مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا ایسا متوالا عرصہ دراز تک شاید ہی کوئی اُٹھے۔ گاندھی جی کی مثال کم ملے گی اور بہت کم' بلکہ نہیں ———— جامعہ عثمانیہ کے ایک شاعر لطیف ساجد نے زیادہ عمر نہیں پائی' صرف ۳۲ سال۔ اُن کا شعری سرمایہ کمیت کے اعتبار سے کم سہی' کیفیت کے اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ گاندھی جی کے قتل پر لطیف ساجد کی نظم " قتیلِ امن " ہمارے شاعروں کے قومی یکجہتی کے جذبات کی دستاویزی شہادت ہے۔ چند شعر ہیں ہے

خوابِ رو خون' ارضِ ہند کہ آج — ہو گیا ہے ترا چمن تاراج
پستیوں سے اُبھارنے والا — تیرے گیسو سنوارنے والا
وہ امینِ شعورِ آزادی ! — نورِ آزادی' طورِ آزادی
جس کے دم سے خزاں تھی لالہ فروش — جس کے دریا کی موج طوفاں جوش
ماورائے حدودِ دیر و حرم — جس کے احساس و فکر کا عالم
رازِ گلِ باریٔ تبسم تھا — وہ ترا آخری ترنم تھا

کنول پرشاد کنول نے بھی "۳۰ جنوری ۱۹۴۷ء کی خونین شام" کے بعنوان گاندھی جی کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ وہی دلوں کو محسوس کر لینے والا انداز، یہ کیا ہوا، یہ کیسے ہوا۔

کیسا ہے آج سارے زمانے میں انتشار — ہر برگ و گل اُداس، چمن سارے سوگوار

دو گولیوں نے لوٹ لی، دولت جہاں کی آج — اس پاک خوں میں بہہ گئی قوم و وطن کی لاج

شعلہ جو اک جہاں کو جلاتا سکھا گیا — تاریکیوں میں آج وہ کیوں کر سما گیا

یہ کیا ہوا، یہ کیسی ہوا جگ میں چل گئی — سورج کو دوپہر میں سیاہی نگل گئی

غرض شعرائے جامعہ عثمانیہ نے قومی یکجہتی پر مختلف زاویوں سے اظہارِ خیال کیا۔ قومی یکجہتی کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلایا۔ اپنے ہم وطنوں کو اس سلسلے میں کوششوں کے لیے آمادہ کیا۔ اس کی خوبیوں کو سامنے لایا اور اس کے ساتھ قومی یکجہتی کی راہ میں پائی جانے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کی سعی کی۔ اُن خطرات کی سمت عوام کی توجہ منعطف کی جو قومی یکجہتی کی مہم کو کمزور کرنے کے درپے تھے۔ و نیز مخالف قومی یکجہتی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے اُن کے سدِباب کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ اُردو شاعری کے اوراق، اس کے شاہد ہیں۔

قومی یک جہتی کے فروغ میں اور بہت سوں کا حصہ ہے۔ کم یا زیادہ، یہ علیحدہ بات ہے لیکن اپنے مخصوص سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور تہذیبی پس منظر کے باوجود شعرائے جامعہ عثمانیہ نے قومی یکجہتی کے استحکام اور فروغ میں جو گرانقدر حصہ ادا کیا ہے، وہ ناقابلِ فراموش رہے گا۔ ہمیشہ ہمیشہ یادگار!

اپنی بات

(صلہ سے آگے) اُردو سے نابلد اور ناواقف نہ رہ سکے گی۔ وقت اور سیلاب کسی کا انتظار نہیں کرتے۔ نہایت تیزی سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے بصارت کے ساتھ بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے سے واقف لوگوں کے لیے وقتاً فوقتاً سیمینار، سیمپوزیم، کنونشن، کانفرنس اور مشاعرہ کا اہتمام و انعقاد بھی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اُردو بولنے والے اب بھی کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۹۷۳ء اور ۱۹۸۱ء میں منعقدہ پہلی اور دوسری آل انڈیا غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس نے بھی اس حقیقت پر مہرِ ثبوت لگادی ہے کہ اُردو، ہندوستان میں رہنے بسنے والے تمام طبقات کا قیمتی اثاثہ اور مشترکہ ورثہ ہے۔ اُردو کے مستقبل کو روشن دیکھنا ہو تو اُردو والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آج کی فکر کریں اور ہماری زبان کی بقا و ترقی اور توسیع و اشاعت کے منصوبوں اور تجاویز کو روبہ عمل لائیں۔

——— محمد منظور احمد

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا

دو غزلیں

خزاں کی رُت میں نویدِ گلاب مت دیجے
ہماری جاگتی آنکھوں کو خواب مت دیجے
نفس نفس کو نہ یوں مبتلائے غم کیجے
نظر نظر کو فریبِ سراب مت دیجے
تمہارے وعدوں پہ جینے سے لوگ باز آئے
اب ان کو اور زیادہ عذاب مت دیجے
ہم اہلِ آرزو اس بات پر بھی راضی ہیں
سوال غور سے سنیئے جواب مت دیجے
ہم اپنے دل ہی جلا کر اُجالا کر لیں گے
اُدھار مانگے ہوئے آفتاب مت دیجے
حقیقتوں کی تہیں کھولتے ہیں آئینے !
بے آب چہرے کو غازے کی آب مت دیجے
جو نا سمجھ ہیں وہ کیا اس کی قدر پہچانیں
ہر اک کے ہاتھ میں دل کی کتاب مت دیجے
ہمارے صبر و تحمل کی داد تو دیجے !
خود اپنے جور و ستم کا حساب مت دیجے
نہیں ہے حشر سے کم زندگی اے منشا !
عذاب کے سوا کوئی خطاب مت دیجے

شریکِ سوزِ دروں جب سے ہو گئے الفاظ
نوائے درد میں شعلے پرو گئے الفاظ
سُنا کے داستاں انجانی وارداتوں کی !!
نجانے کتنوں کے دامن بھگو گئے الفاظ
کبھی کبھی تو کچھ ایسا بھی اتفاق ہوا
تڑپ کے جاگ اُٹھے ارماں تو سو گئے الفاظ
کسی کی چشمِ تغافل کا کیا گلہ کیجے !
ہجومِ شوق میں جب خود ہی کھو گئے الفاظ
ملی نہ جب انھیں ابلاغ کی توانائی
خود آپ اپنے مقدر کو رو گئے الفاظ
اُٹھے تو سارے زمانے کی بن گئے آواز
دبے تو آبرو اپنی ڈبو گئے الفاظ
خطیبِ شہر نے کی بات دوستی کی مگر
دِلوں میں تخمِ عداوت کے بو گئے الفاظ
غزل سرائی منشا پہ یوں ہوا محسوس
کہ جیسے روح کے اندر سمو گئے الفاظ

عابد پیشاوری

دوہے

جوہر اصل جواہری، بے جوہر سب سنگ — مٹی خربوزے بہم، دیکھ نہ پکڑیں رنگ

مذہب ملک زبان کے سارے رشتے جھوٹ — بس اک آدم زادگی، رشتہ اصل الوٹ

چاہے کیسی دھاک ہو چاہے کتنی ساکھ — نور سے روشن خاک ہے، نور نہیں تو راکھ

ایک نحوست کی گھڑی جس دم پر پھیلائے — آئندہ سب زندگی، سایوں سے بھر جائے

اعلیٰ فطرت، عالی ظرف رہیں سدا دل تنگ — دوں فطرت ذی مرتبت، یہ بھی اس کے رنگ

ان لوگوں کا دین کیا، کیا ان کا ایمان — ہونٹوں پر اللہ ہے اور دل میں شیطان

لاج شرم سب اس میں ہے اسی میں تخت و تاج — ہو نہ کسی کا دہر میں، کوئی کبھی محتاج

ہاتھ پانو چلتے رہیں، بس حسبِ معمول ! — اک یہ دعا قبول تو ہر اک دعا قبول

اوّل ہستی خواب ہے، پھر ہم خواب خراب — یہ بھی تماشا دیکھیے، خواب کے اندر خواب

صاحبِ افسر ہے کوئی یا شاہِ بے تاج — اگر غور سے دیکھیے سب کے سب محتاج

اُتر جائیں گی آندھیاں، ٹوٹ جائے گا زور — دو لمحے کی زندگی، لمحے بھر کا شور

موت سے سب مجبور ہیں کیا طاقت کیا علم — موت نہ مانے سرکشی، موت نہ جانے حلم

تنگ نہیں دامان بھی، دل بھی نہیں ہے تنگ — یہ خالی محروم وہ، مولا تیرے رنگ

چشمے جھرنے پھول پھل، انساں پتھر سائے — ہم عاشق ہیں حُسن کے حُسن جہاں مل جائے

کیا قومیں، افراد کیا، کیا اپنے کیا غیر — غرض بنائے دوستی، غرض مٹائے بیر

عابدؔ صاحب زندگی آتی جاتی سانس — کون سانس کیا جانیے بن جائے کب پھانس

عابدؔ اپنی لاش پر کرے نہ کوئی بین ! — جب ہم سُن ہی نہ پائیں گے کیوں کوئی کھوئے نین

ہر دو میں سے آدمی، ایک چلن اپنائے — تن کے وفا شعار سے، من کی کہی نہ جائے

شرح و بیاں سے ماورا، بے انداز بسیط — ارض و سما پناہ دل، دل کونین محیط

ڈوری جس کے ہاتھ میں، پُتلی اس کی میت — جو بنسی کو سانس دے، گائے اس کے گیت

مکر و ریا منافقت، گے خون میں رچ! — دلوں میں نفرت موجِ زن، لبوں پہ جھوٹا سچ !

انسانی انصاف ہے، انسانی قانون — امن و اماں کے نام پر دہشت وحشت خون

ہے یہ اپنے دور کا، رحم، کرم، انصاف اک مذہب کی آڑ میں لاکھوں خون معاف

ہے شرفا کی دہر میں، ایسے بود و باش گِدھوں کے گھیرے میں ہو، جیسے بے بس لاش

کون عزیز کیا اقربا، کون دوست کیا یار رشتے بھی بیوپار ہیں، ناتے بھی بیوپار

ظاہر میں توقیع ہے، در پردہ تصدیع جس کا دامن تنگ ہے، اُس پر کرم وسیع

غرض کی خاطر کیوں کوئی پوجے پیر، فقیر بنے تو اس سے مانگیے، جو پیروں کا پیر

اتھل پتھل کر جائے سب دو پل کا طوفان باطن کا عالم جہاں ہر لمحے گھمسان؟

رحمت بے پایاں سہی، لیکن یہ تفریق! ملے سمندر ظرف کو، قطرے کی توفیق!

ظاہر سب مسرور ہے باطن سب رنجور تن سالم بے داغ ہے، من زخموں سے چور

جاہل تو بخشیدنی، لیکن جہل پرست!
جتنا اونچا مرتبہ، ذہنیت اتنی پست!



ڈاکٹر جیلانی بیگم

دکنی شاعری کی روایات

جس طرح زبان اردو دہلی میں پیدا ہو کر گجرات پہنچی اور گجری کہلائی اسی طرح دکن پہنچ کر دکنی کہلائی دکنی قدیم اردو کا وہ روپ ہے جس کی ادبی نشو و نما ابتدائی زمانے میں دکن اور گجرات میں چودھویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے سترھویں صدی کے اواخر کے دوران میں ہوئی۔ یہ زبان بھی جدید ہند آریائی کی ایک شاخ ہے اور اس کا آغاز بھی جدید ہند آریائی زبانوں پنجابی، سندھی، مغربی ہندی، راجستھانی، گجراتی، مرہٹی، اڑیا، بنگالی اور آسامی کے ساتھ ساتھ ہوا لیکن نشو و نما کے اعتبار سے یہ اودھی کی معاصر ہے۔ دکنی کا سارا سرمایۂ الفاظ ہند آریائی ماخذوں پر مبنی ہے اور قواعد کا ڈھانچہ بھی ہند آریائی بولیوں سے مطابقت رکھتا ہے۔

علاء الدین کے حملۂ دیوگیر سے کچھ پہلے شمال کے مسلمان صوفی اس نواح میں آنے لگے تھے اور خاموشی سے اپنے کام میں معروف تھے۔ حاجی رومیؒ ۱۱۹۰ء، سید شاہ مومنؒ ۱۲۰۰ء، بابا سید منظہر عالمؒ ۱۲۲۵ء، شاہ جلال الدین گنج رواںؒ ۱۲۴۷ء، سید احمد کبیر حیات قلندرؒ ۱۲۲۶ء، بابا شرف الدینؒ ۱۲۸۸ء، بابا شہاب الدینؒ ۱۲۹۱ء وہ چند برگزیدہ شخصیتیں ہیں جو سرزمینِ دکن پر تبلیغی و روحانی کام کر رہی تھیں۔ علاء الدین کی فتح دکن کے بعد روحانی پیشوائی کے اس سلسلے کو اور فروغ حاصل ہوا اور یہاں ہمیں پیر مقصودؒ ۱۳۰۰ء، پیر جماؒ ۱۳۰۳ء، شاہ منتجب الدین زر زری بخشؒ ۱۳۰۹ء، پیر مٹھےؒ ۱۳۳۱ء، حضرت گیسو درازؒ کے والد سید یوسف شاہ راجو قتالؒ ۱۳۳۵ء، شاہ برہان الدین غریبؒ ۱۳۳۷ء اور بہت سے دوسرے صوفیائے کرام دکن کے مختلف علاقوں میں تبلیغ دین میں معروف نظر آتے ہیں ان بزرگوں نے یہاں کی مقامی زبانوں کے الفاظ کو شمال کی زبان میں ملا کر ایک ایسا ہیولیٰ تیار کیا جس سے اظہارِ بیان کی مشکل حل ہو گئی، اردو زبان کی ابتدائی ترقی میں ان لوگوں کی گراں قدر خدمات ناقابلِ فراموش

ہیں۔

بارھویں صدی کے اواخر میں شمال سے فوجوں کی آمد کے ساتھ ہند۔آریائی کی ایک سے زیادہ بولیاں دکن پہنچی تھیں اس کا اندازہ ہم کو ادبی دکنی کے قواعد کے روپ اور خاص طور پہ ضمیروں اور افعال کی شکلوں کے تنوع سے ہو جاتا ہے شمال سے دکن کا باضابطہ اور طبعی، تہذیبی اور لسانی الحاق اسی زمانے سے ہونے لگا۔علاء الدین خلجی نے ۱۳۲۵ء میں دیوگیری پر حملہ کیا اور اسے فتح کر کے، یہاں کے انتظامات کرنے کے لیے ہر حلقے میں ایک ترک سردار مقرر کیا، جو"امیر صدہ" کہلاتے تھے۔ان امیروں نے یہاں رہائش اختیار کر کے اپنے لواحقین کو بھی بلالیا۔یہ امیر اور ان کے لواحقین جو مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے جب آپس میں ملتے تو اس مشترک زبان میں بات کرتے جو وہ شمال سے اپنے ساتھ لائے تھے، جس پر پنجابی، اودھی اور برج بولیوں کے اثرات تھے، مقامی باشندے بھی اپنی زبان کے الفاظ اس شمال کی زبان میں شامل کر کے اسی زبان کے ذریعے اپنا مافی الضمیر ادا کرتے۔اس صورتِ حال کے اعتبار سے مختلف بولیوں کی ملاوٹ سے جو نئی زبان بنی اسے دکنی کہا جانے لگا۔

دکن میں اس زبان کے جلد نشو و نما پانے اور ادبی بولی کی حیثیت اختیار کرنے کا ایک سبب یہ تھا کہ جنوبی ہند کے مختلف اللسان علاقوں میں شمال سے آنے والوں کے لیے اتحاد کا واحد سہارا یہی زبان تھی۔جب محمد تغلق کی سخت گیریوں سے برگشتہ ہو کر امیرانِ صدہ نے دہلی سے اپنا رشتہ توڑ لینے کا فیصلہ کر کے علم بغاوت بلند کیا اور دکن پر قبضہ کر لیا۔گلبرگہ کو پایۂ تخت قرار دیا اور ایک نئی سلطنت کی بنا ڈالی جو سلطنت بہمنیہ کہلائی۔ان لوگوں نے شمال دشمنی کے جذبے کے تحت ان تمام عناصر کو ابھارا، جو شمال سے مختلف تھے اور جو دکن سے تعلق رکھتے تھے۔انھوں نے دل کھول کر مقامی روایات کی حوصلہ افزائی کی۔دیسی رسوم و رواج، میلوں، ٹھیلوں اور تہواروں کو ترقی دی۔باہمی ربط ضبط، میل جول اور معاشرت و تہذیب کو گہرا کرنے کے لیے اس زبان کی سرپرستی کی جو رنگا رنگ زبانوں کی اس سرزمین میں بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے رائج تھی اور جسے آج ہم اردو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اس عمل سے جنوب نے شمال کے خلاف ایک تہذیبی دیوارِ مدافعت کھڑی کر دی اور برعظیم کے یہ دونوں حصے ایک طویل عرصے کے لیے ایک دوسرے سے کٹ کر رہ گئے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۳۴۷ء سے لے کر تقریباً تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہ زبان جو شمالی ہند سے آئی تھی سرزمین دکن کے لسانی و تہذیبی اثرات قبول کرتی ہوئی آزادانہ طور پر نشو و نما پاتی رہی۔لسانی ارتقا کے لحاظ سے شمالی ہند کی زبان اور دکنی کے درمیان تین سو برس کا فصل ہو گیا یہ آگے ہی بڑھتی چلی گئی، یہاں تک کہ اس نے ادبی زبان کا درجہ حاصل

کرلیا اور وہ اپنی جگہ رُکی رہی اور بول چال کی زبان کی سطح سے اونچی نہ اُٹھ سکی۔ جنوبی ہند کی علاقہ واری زبانوں کے اثرات سے دکنی کی نشو و نما میں بڑی مدد ملی۔

شاعروں کی دلچسپی، صوفیائے کرام کی تبلیغ دین اور بادشاہانِ وقت کی سرپرستی سے یہ ایک سرمایہ دار زبان بن گئی۔ سیاسی، معاشرتی و تہذیبی سطح پر اگر یہ صورتِ حال نہ ہوتی جو کہ ان صفحات میں ہم نے بیان کی ہے تو قدیم اُردو کا دکن میں پھیلنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

دکنی محض اُردو کی ابتدا نہیں بلکہ ایک علیٰحدہ سمت میں اس کی انتشار ہے۔ یہ وہ اُردو ہے جو اُتر کی اُردو سے زیادہ ہندوستانی اور مقامی رنگ کی حامل ہے۔ اس کے بعض لفظ اور بہت سی نحوی ترکیبیں مرہٹی ہیں اور اس کی سُریلی تان تلنگی سے مستعار ہے۔ اینگلو سکسن کے برخلاف دکنی ایک متروک زبان نہیں ہے بلکہ آج بھی مختص اور تازہ ہے۔ دکنی کی بول چال کی روایت تو مسلسل ہے اس کی ادبی روایت بھی مری نہیں ہے۔ دکنی ادب کے تعلق سے اقبال کہتے ہیں کہ " اُردو کی تاریخ میں دکنی ادبیات کا حصّہ نسبتاً جاندار نظر آتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی سے دکنی ادبیات کا تعلق اصلی اور اساسی ہے" اس کے علاوہ بھی دکنی ادبیات کو مذہب سے نہایت گہرا تعلق ہے۔

قدیم دور کا ادب اسی لیے آج کی زبان سے مختلف ہے کہ یہ عبوری دور کا ادب ہے' اُردو ادب کے ابتدائی زمانے کے دو دور ہیں' ایک مذہبی دور جو ۱۳۵۰ء سے ۱۵۹۰ء تک ہے' دوسرا ادبی دور ہے جو ۱۵۹۰ء سے ۱۷۲۰ء تک ہے۔ اس دور میں اُردو ادب عملاً دکن تک محدود تھا اور شمالی ہندوستان کے اہل قلم فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے تھے۔ دکنی شعر و ادب کا زمانہ بہمنی عہد کے آغاز یعنی ۱۴۰۰ء سے لے کر عالمگیر کی فتح دکن یعنی ۱۷۰۰ء تک تقریباً چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے دکنی شاعری کے اولین نمونے ملنے شروع ہوتے ہیں اور اٹھارویں صدی کے وسط تک دکنی کے سرمایہ میں بلند پایہ شعرا کے کلام سے اضافہ ہوتا رہا۔ سترھویں صدی دکنی شاعری کا سنہرا دور ہے جس نے محمد قلی' وجہی' غواصی' نصرتی اور ہاشمی جیسے شاعر اُردو کو دیے' انگریزی ادب کی معاصر تاریخ میں یہ شیکسپیئر کا اور ڈرائیڈن کا عہد ہے۔

پندرھویں اور سولہویں صدی میں دکنی شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں اُنھیں صوفی شعرا کی مثنویوں کے علاوہ " کدم راؤ پدم راؤ " اور اشرف کی مثنوی " نوسرہار " قابلِ ذکر ہیں۔ شاعری کے ان نمونوں کو اُردو زبان کی تاریخ میں لسانی نقطۂ نظر سے اہمیت حاصل ہے ادبی اعتبار سے ان کی چنداں اہمیت نہیں ہے لیکن سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے دکنی ایک بولی کی حیثیت سے گذر کر

مستقل ادبی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی اور شاعری کے ایسے کارنامے اس عہد میں تخلیق ہوئے، جن پر اردو زبان آج بھی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے مگر اردو کے عام قاری کے لیے زبان کی قدامت ان ادبی شہ پاروں کی تحسین کی راہ میں حائل ہے۔

قدیم دکنی شاعری پر ہندوستانی شاعری کی روایت کا اثر غالب ہے۔ دکنی کے شعرا نے فارسی شعر و ادب سے بھی استفادہ کیا ہے شاعری کی ساری اصناف غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی وغیرہ فارسی سے مستعار ہیں۔ فارسی کی بحریں بے کم و کاست دکنی میں قبول کر لی گئیں۔ دکنی کی متعدد مثنویاں فارسی کی مثنویوں کے خاکوں پر مبنی ہیں لیکن جہاں تک شاعری کی روح اور اس کے مواد کی پیشکشی کا تعلق ہے، دکنی کے قدیم شعرا بڑے صحت مند ادبی مذاق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اپنی شعری تخلیقات میں وہ فارسی کی کورانہ تقلید کو کبھی روا نہیں رکھتے۔ ان کے تخلیقی رویے میں بڑی خود اعتمادی اور استقلال ذہن کی شان نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری میں محبوب کے لیے ہمیشہ مذکر کا صیغہ استعمال ہوتا رہا ہے جو امرد پرستی کی روایت کا اثر ہے برخلاف اس کے دکنی شعرا نے اس غیر حقیقی رجحان سے انحراف کیا اور ہندوستانی رسم کے مطابق معشوق کے لیے مونث کا صیغہ استعمال کیا۔ دکنی شاعری میں مرد کی مخاطبت صنف نازک سے ہوتی ہے یا پھر قدیم ہندوستانی روایت کے مطابق عورت کی طرف سے اظہار ہو تو مخاطب مرد ہوتا ہے۔ دکنی شاعری کے اولین نمونوں سے لے کر ولی کے ابتدائی دور کے کلام میں ہر جگہ محبوب کی صورت میں ایک ہندوستانی عورت کا تصور ملتا ہے جس کے حسن و جمال اور آرائش کے تفصیلی مرقعے ہر شاعر کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ مثلاً:

تو اسو لیہ سنگھار کوں جب پین آئے   تجھ دیکھ کر عیشاں پاسے آنند

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی غزلوں میں ان حسیناؤں کے نام گنائے ہیں جو اس کے محل کی زینت تھیں، ان غزلوں میں محمد قلی نے اپنی محبوباؤں کے عشوہ و جمال کی دل کھول کر داد دی ہے:

پیاریاں منالیا ؤ پیاری کوں آج   کہ سب چھنو بھریاں کا ہے سیس تاج

یہ اشعار اس دور کی دکنی معاشرت، رہن سہن، لباس، زیورات اور تہذیب کی بھی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

ہندی شاعری کے اثر سے دکنی غزلوں میں کہیں کہیں مرد مخاطب ہوتا ہے اور جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے ہوتا ہے۔ جیسے:

پیا بن ... شکتی ہوں میں دو دیکھ کہاں ہے   مرسوں سکی چل جاتی وے تمہار کہاں ہے

دکنی شاعری میں عورت کے جذبات کی ترجمانی کے علاوہ اس کی نفسیات اور اس کی فطرت کے شعور کا احساس بھی شامل ہے مثلاً:

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانا کر کو موتیاں کا پروی ہار بیٹھوں گی

دکنی شاعری میں محبوب کا جو تصور ملتا ہے وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے وہ گوشت پوست کا جیتا جاگتا مادی اور مجازی محبوب ہے، روایتی محبوب یا محض تخیل کی پرچھائیں نہیں۔ یہ محبوب اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور آرائش کے ساتھ اپنی اصلی جنس میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ جیسے :

مری سانولی من کی پیاری دِسے   کہ رنگ روپ میں کنول ناری دِسے

دکنی شاعری کی ایک بنیادی اور منفرد خصوصیت حقیقت نگاری ہے، آج کے دور میں بھی اس خصوصیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ دکنی شاعری کا ایک اور نمایاں وصف اظہار بیان کی سادگی ہے جس کو ہم ایک جاندار اور صحت مند روایت کہہ سکتے ہیں۔ دکنی شعرا اپنے مشاہدات، تاثرات، اور جذبات کو بے جا تکلف اور تصنع کے بغیر راست، سادہ اور فطری لیکن پُر زور اور موثر اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ پُر تکلف اسلوب سے گریز اور فطرتِ انسانی کے جذبات کا موثر اظہار ہر زبان کے ابتدائی دور کے فن کاروں کا ایک نمایاں وصف رہا ہے۔ انگریزی میں چاسر اور شیکسپیر بھی انہی خصوصیات کے لیے ممتاز ہیں۔ دکنی شعرا نے اپنے کلام میں اپنے ذاتی تجرباتِ عشق کو بلا تکلف پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اس میں حقیقت پسندی کا رجحان واضح طور پر ملتا ہے مثلاً محمد قلی نے اپنے تجرباتِ عشق کو من وعن اپنی شاعری میں پیش کیا ہے:

پیاری اور پیاہت میں سوہت ہے   مرو بن میں نرگس گل پھول مالا

حقیقت نگاری کے رجحان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قدیم دکنی کے فن کار اپنی شاعری کا مواد اطراف و اکناف کی زندگی، مقامی ماحول اور مقامی روایات سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ سارا مواد جو ان کے جمالیاتی تجزیہ کا جزو ہے ان کی تخلیقات میں بڑی دیانت داری کے ساتھ منعکس ہوتا ہے دکنی شاعری میں کوئل کی کوک بھی سنائی دیتی ہے اور پپیہے کی پکار بھی۔ بادل کی گرج کے ساتھ مینڈک کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ کہیں شاعر اپنی سکھیوں کے ساتھ بسنت کھیلتا نظر آتا ہے کہیں دیوالی کے دیے دکھائی دیتے ہیں، مثلاً :

گرج بادل تھے داد رگیت گاوے کوئل کوکے سو بھل بن کے خیالا
بسنت کھیلیں عشق کا آ پیارا تمہیں ہیں چاند میں ہوں جیوں ستارا

دکنی شاعری میں اخلاقی عناصر بھی موجود ہیں۔ دکنی شاعری میں غزل کی بھرمار نہیں ہے بلکہ یہاں ابتدا ہی سے مثنوی کا رواج زیادہ رہا ہے، بعد میں غزل اور دوسری اصناف کا رواج ہوتا گیا۔ دکنی مثنویوں کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں ہندو دیومالا کے اثرات سے ماورائی اور غیرحقیقی فضا پیدا ہوگئی ہے، دوسری طرف یہ مثنویاں معاشرے کے لیے اجتماعی زندگی کی تفریح کا بہترین مشغلہ تھیں اسی وجہ سے ان میں عوامی مذاق سے قربت اور ان کے احساسات اور طرزِ فکر کی ترجمانی موجود ہے۔ دکنی شعرا کے کلام میں موسیقیت کا حسن بھی موجود ہے۔ ان کے اظہار میں بیساختگی، سادگی، روانی اور سلاست ہے جس کی وجہ سے کلام میں شیرینی اور دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ دکنی شاعری رجائیت کی علمبردار ہے چوں کہ دکنی شعرا کو خوش حالی، امن وامان اور ذہنی سکون حاصل تھا اس لیے ان کی نظر ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو پر پڑتی تھی۔ دکنی شاعری میں خوبصورت استعارے حسین تشبیہات، صنائع بدائع وغیرہ کی بہترین مثالیں ملتی ہیں مثلاً :

نین ہیں دو پیاری کے جیسے ممولے
بھنواں کی ترازو میں بھو چند تولے

شعرائے دکن نہ صرف زبان کی انفرادیت بلکہ خیالات کے امتیازات کے باعث اس اعزاز کے مستحق ہیں کہ ان کو ایک الگ دبستانِ شاعری قرار دیا جائے بلاشبہ ہم کو ان کے یہاں اس دور کی تہذیب، آدابِ معاشرت، اشخاص، سلاطین، مشائخین، علما، معاشرتی وسماجی رجحانات اور سیاسی اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس نے دورِ جدید میں بہت سے مفکرین کو اس عظیم ذخیرۂ شاعری کی طرف متوجہ کر دیا ہے۔ دکن کی شاعری کو ہم اردو کا قدیم دبستانِ شاعری کہہ سکتے ہیں جس سے ہم کو اس زبان کے تدریجی ارتقا کا صحیح پتہ چلتا ہے ساتھ ہی ان رجحانات اور روایات کی نشان دہی بھی ہوتی ہے جن سے ہم شمال اور جنوب کے دبستان شاعری میں امتیاز کر سکتے ہیں۔

غزلیں

مہدی پرتاپگڑھی

مری ناگفتہ حالت پر تسلی دینے آیا تھا
وہ انساں اندر اندر سے جو خود ٹوٹا تھا بکھرا تھا

اذیت ناک لمحوں میں جو اکثر یاد آیا تھا
تمہارے قرب کا لمحہ شریکِ درد میرا تھا

میں تھا بستر پہ لیکن ذہن دفتر میں بھٹکتا تھا
ہزاروں مسئلے میں فائلوں میں چھوڑ آیا تھا

[illegible]
[illegible]

اُسے دنیا کی وسعت کی بھلا کیسے خبر ہوتی
کہ وہ اب تک حصارِ ذات سے باہر نہ آیا تھا

نمایاں تھا توانائی کا عنصر اس کے لہجے میں!
یہ دھوکا ہے نگاہوں کا کہ وہ بیمار لگتا تھا

جو میرے پھوس کے چھپر پہ طعنہ زن تھا اے مہدیؔ
وہ دانشور تو خود بھی ریت کے ٹیلے پہ بیٹھا تھا

اقبال ہاشمی

جو اپنے لوگ تھے لگتے ہیں سب پرائے مجھے
مقابلے کو بلاتے ہیں میرے سائے مجھے

مرے وجود کو دیتی ہے اپنی رائے مجھے
میں خود سے روٹھا ہوں کیسے کوئی منائے مجھے

نجانے کون سے دیمک زدہ صحیفے پر
وہ گرد پوش کی مانند پھر چڑھائے مجھے

میں اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا ہوں کہیں
کسے پڑی ہے جو صحرا سے ڈھونڈ لائے مجھے

میں ایک برگ ہوں اور زیرِ سنگ رہتا ہوں
ہوا میں زور اگر ہے تو پھر اڑائے مجھے

میں آفتاب کی مانند جل رہا ہوں مگر
اب ہاشمی کسے حاجت ہے جو بجھائے مجھے

یوسف اعظمی

قید

میں ایک چیخ ہوں، رنگوں میں جو مقید ہے
میں ایک شہر ہوں، سناٹا اوڑھ کر چپ ہوں
میں ایک زخم ہوں، خوشبو کا رنگ پہنے ہوئے
میں ایک گونج ہوں، ذہنوں میں جو سلگتی ہے

پتہ نہیں میری چیخوں کو کون سمجھے گا
میں ایک گونگے کی مانند ہوں ننگا ہوں میں
میرے وجود میں چیخوں کا اک سمندر ہے
زمانہ جس کو سمجھتا نہیں اشاروں میں
اُلجھ گئی ہے مری آگہی سرابوں میں
حیات رینگتی دیکھی فقط کتابوں میں

پتہ نہیں کہ مری چیخ کب خبر بن کر
حصار توڑ کے نکلے گی روشنی کی طرح
مجھے بہاؤ ملے گا جواں ندی کی طرح
ابھی حیات تو مٹی کا اِک کھلونا ہے
بہانہ اوڑھ کے جیتا ہوا نمونہ ہے

میں منتظر ہوں میری چیخ جب نظر بن کر
ہر ایک گھر میں بکھرنے لگے خبر کی طرح
اس انتظار کی ساعت گراں سہی لیکن
اس انتظار میں جینا ہے عمر بھر کے لیے
میری صدائیں ہیں ٹھہری ہوئی سفر کے لیے

شاہدہ احمد

سوغات

زمان میاں کا اضافہ بھی خاندان میں خوب ہوا۔ اچھے خاصے آبنوس کا کندہ تھے مگر دل اتنا ہی سونے کے پانی سے دھویا آٹے کی لوئی جیسا نرم گدگدا۔ روز ایک نیا شوشہ بغل میں دبائے آموجود ہوتے اماں تو درگذر کر جاتیں لیکن بھابی جان کے ناک بھوں دیکھنے والے ہوتے۔ گورے چٹے بگلہ جیسے گھرانے میں واقعی زمان میاں کا اضافہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی اور یہ سارا کیا دھرا فریدہ کا تھا۔ خدا جانے گنوار و پنجابی لڑکے کی کیا چنیر بھائی کہ بھابی جان کے رکھ رکھاؤ والے بھائی کی نسبت پر ٹھوکر مار زمان سے بیاہ رچا کر بیٹھ گئی۔ جس کی سیدھی بات بھی گھر والوں کے سر پر اینٹ کے ادّھے کی طرح لگتی۔ اچھا ایم اے پاس کرنے چلی تھی کہ کالا کوا ساتھ لگا لائی۔

"اے کوئی جوڑ ہوتا ہے، کوئی تک ہوتا ہے" بھابی جان اپنی خوبصورت ناک سکوڑ کے تیز چلاتیں۔

"اللہ بخشے ابا مرحوم کہا کرتے تھے 'خدا چمار بنا دے چمار کی سی شکل نہ بنائے'"

اوپر سے زمان میاں کی خدا ترسی روز کوئی نہ کوئی نیا گل کھلائے رکھتی۔ آج کسی بیوہ کا شانہ ہے تو کل کسی یتیم کا بکھیڑا ——— اور جب بات کھلتی کہ بیوہ اچھے خاصے ہٹے کٹے خصم کی مالک اور یتیم دو عدد ماؤں اور ایک باپ کی ولاشت رکھے ہوا تو سب دانت پیس پیس کر زمان پر چڑھائی کرتے ان ہی سب بکھیڑوں سے تنگ آکر فریدہ انھیں لندن گھسیٹ لے گئی، جہاں پہنچ کر کم از کم بیواؤں اور یتیموں سے جان چھٹی۔

مگر جیسے ہی چار سال بعد چھٹی پہ وطن پہنچے ایک نیا چاہنے والا مل گیا۔

"سن اوئے میاں، اچھی طرح سبق یاد کر لے۔ ماں، پھپھو تیرے بھوکے مر رہے ہیں اور جوان بہن

بغیر دوپٹے کے بیٹھی ہے آگے جو تیری مرضی آئے بولتا جانا مگر اتنا سمجھ لے اصل بات تیرے منہ پر نہ آئے کہیں بتانے بیٹھ جا سب کے آگے کہ جی بیگار کیمپ سے بھاگا ہوا ہوں۔ متھے باندھ لے میری بات اچھی طرح ورنہ تجھے ہی بھگتنا پڑے گی۔"

یوں پڑھا لکھا کے وہ اُسے بغل میں داب لے گھر میں داخل ہوئے 'میلا چکٹ' جگہ جگہ سے پھٹا کرتہ 'اُدھڑی ہوی ایڑیاں' آنکھوں کے گرد بڑے بڑے سیاہ حلقے' جلی جلی رنگت' جیسے بارہ برس کے بچے کا حلیہ نہ ہو کسی کہن سال مُردے کا ڈھانچہ ہو۔

سب سے پہلے تو اماں کے سامنے اُسے انٹرویو دینا پڑا۔ انہوں نے بمشکل اپنی تسلی کر کے مارجن پر تینتیس نمبر دے کے پاس کیا۔ اس کے بعد بھابی جان کی عدالت میں حاضری ضروری سمجھی گئی۔ عین اُس وقت جب کہ وہ بھی جان سے تہیہ کئے بیٹھی تھیں کہ چھٹتے ہی بڑے سے انڈے کے ساتھ فیل کر کے اُسے چلتا کریں۔ بیچو روتا دھوتا اُن کا دوپٹہ کھینچنے لگا۔

" بھکو لگی ہے ماما" اس نے پیٹ ننگا کر کے بجانا شروع کر دیا' معلوم نہیں اس کے ننگے پیٹ پر ہاتھ مار مار کے رونے کا کوئی خاموش رد عمل ہوا یا بچے کی اتھل پتھل میں اُنہوں نے گڑبڑا کے اُسے تینتیس نمبر دے ڈالے۔ اس طرح مارے باندھے اُسے سر چھپانے کا تو آسرا مل گیا لیکن اس کی ذات سے چھپے شکوک بدستور قائم رہے۔

" پائیو! ذرا دھیان رکھا کرو۔ سارا گھر اندر باہر کھلا رہتا ہے ذرا دھیان کا کیا لے کر چپت ہو گیا کوئی قیمتی سامان تو کہیں نکال کے دکھادیں گے کون سا باوا کا مال ہے جو جی دُکھے گا۔" بھابی جان آتے جاتے چھوٹی نند کو تاکید کرنا نہ بھولتیں۔

" اماں! مجھے تو ڈر لگتا ہے اس کلموہے سے کبھی غور کیا آپ نے کام کرتے کرتے کیسے ایک ہی طرف ٹکر ٹکر تکنا شروع کر دیتا ہے' پلک تک نہیں جھپکتی کم بخت کی۔ آوازیں دیے جاؤ منحوس کو خبر نہیں کہاں غارت رہتا ہے۔" پائیو نے اماں کے گھٹنوں میں گھستے سرگوشی کی۔

" آپ ہی تو کہتی ہیں کہ جن کی پتلیاں نہیں پھرتیں وہ ہم میں سے نہیں ہوتے' اس کلموہے کی پتلیاں کبھی تو لگتا ہے پھرتی ہیں اور کبھی لگتا ہے بس ایک ہی جگہ جمی ہیں' جیسے سریش لگا ہو یا گوند' سمجھ نہیں آتی یہ ہم میں سے ہے یا ہم سے باہر کا۔"

" ہوش تو ٹھکانے ہیں بچی؟" اماں نے حمائل شریف پڑھتے پڑھتے چونک کے پائیو کی طرف دیکھا' مارے ہول کے جن کا جی اُلٹنے لگا!

"ارے اِدھر تو آنا سوغات!" انہوں نے کانپتی کانپتی آواز میں کیاریوں میں پانی ڈالتے سوغات کو پکارا۔ اُسے یہ نام اماں نے زمان میاں پر احسان دھرتے یہ کہہ کے دیا تھا کہ: "بھیا رکھ لی ہم نے تمہاری لائی سوغات۔"

خبر نہیں کیسا کال آپڑا ہے نوکروں چھوکروں کا کہ آنکھ میں لگانے کو نہیں ملتے، پہلے تو اماں، باوا خود گھر والوں کے ہاتھ میں سونپ کے جاتے تھے، چھوکرے، چھوکریاں، اب یا تو ملیں گے نہیں یا پھر خود ہی اٹھلو چولھے کی طرح آن کھڑے ہوں گے، بڑوں، بزرگوں کا کوئی پتہ ٹھکانہ ہی نہیں ملتا۔

اب کسی وقت وہ کلموہے کے نام سے پکارا جاتا، کبھی ہولو، تو کبھی سوغات۔ اُس کا اپنا کیا نام تھا اُسے خود نہیں معلوم تھا، جس نے جس نام سے پکارا اُسی پہ پلٹ کے دیکھ لیا۔ امّاں نے آواز دی تو پانی کا برتن ایک طرف رکھ کے ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ حمائل شریف ایک طرف رکھ کے انہوں نے ڈری ڈری نظروں سے اس کی پُتلیوں میں جھانکا ایسے میں انھیں لگا ابھی وہ اپنی انگشتِ شہادت اُٹھا کے ان کی طرف کرے گا اور اس کی انگلی بڑھتے بڑھتے ٹھک سے ان کی ناک پہ آ لگے گی تو وہ دانت نکال کے ہنستا ہوا پلک جھپکنے میں غائب ہو جائے گا۔

دہشت سے وہ پسینے پسینے ہو گئیں اور سوغات کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے بے وجہ بلائے جانے پر معصومیت سے آنکھیں جھپک جھپک کے اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ •

"جا رے بچے کچھ نہیں جا کر اپنا کام کر۔" انہوں نے کس کے دو ہتڑ پائیو کی پیٹھ پہ جما دیا۔

"کم بخت لے کے جان نکال لی تو نے میری، اچھا خاصہ ہم میں ہی سے تو ہے۔"

اس خوف کے دل سے نکلتے ہی کہ وہ ہم ہی میں سے ہے، ہم سے باہر کا نہیں، پائیو نے پوری چوکسی سے بھابی جان کی ہدایت کے مطابق اس پر نظر رکھنی شروع کر دی۔

"لے کلموہے ذرا یہ گنترے اور کلوٹ کھنگال کے الگنی پہ ڈال دے۔" بھابی جان نے گو موت میں بسے گنتروں کا ڈھیر اس کے سامنے انبار کیا تو وہ جو پورے گھر کے فرش پہ پوچا لگانے کے بعد اپنے سخت کھردرے ہاتھوں کو کسی بڑے فلسفی یا مفکر کی طرح غور سے دیکھ رہا تھا، چُپ چاپ گنترے اُٹھا کے نل کے نیچے لے آیا۔

گنتروں میں بسی گندگی کی طرف تکتے تکتے خبر نہیں اسے کیا ہوا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ صحرا کی بہت سی تپتی ہوئی ریت اُس کی آنکھوں میں گھس گئی۔ چیتھڑوں میں لپٹے بے گنتی بے شمار ننھے ننھے کیڑوں جیسے وجود اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کھڑے ہو گئے۔ کسی کے سر پیدائش کے جسم سے بڑی

نگاری لدی تھی، کسی کے خراش زدہ ہاتھوں میں کدالیں کانپ رہی تھیں اور کیڑوں کی ننگی پیٹھوں پر تجریدی آرٹ کے نمونے نقش تھے۔ نیلی نیلی آڑی ترچھی بدھیاں جن کے بیچ سُرخ سُرخ جیتا جاگتا لہو۔ وہ پڑھا لکھا بالغ ذہن ہوتا تو ان نمونوں کو آرٹ گیلری میں سجا کے دنیا میں تہلکا مچا دیتا۔ لوگ پکاسو کو بھول جاتے۔ لوگ چغتائی کو فراموش کر دیتے۔

"ارے منحوس تو یہاں بیٹھا جھک مار رہا ہے؟ میں تجھے سارے گھر میں جھانکتی پھری کیسے لوٹے ہاتھوں سے پوچا لگایا ہے، یہ بڑے بڑے دھبے چمک رہے ہیں سارے فرش پر۔" پایو کی تقریر پر پاس سے گزرتی اماں نے بھی جملہ اچھالا۔

"ہاں روٹیاں ٹھونسنے میں تو بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ دے کام کے لیے ہاتھ چلاتے ضعف پڑتا ہے۔"

روٹیوں کے نام پر اس بھوکے ندیدے کے پیٹ میں سچ مچ کھڑ بڑ ہونے لگی۔ بھرے پیٹ پہ بھی خبر نہیں کیوں اسے لگتا صدیاں گذریں، جب اس نے سیر ہو کے کھانا کھایا تھا۔ کب؟ یہ یاد نہیں۔

نہا دھو کر پایو نے سفید قمیض، شلوار پر نیلا دوپٹہ اوڑھا اور سر پہ تولیہ لپیٹے غسلخانے سے باہر نکلی تو سبزی بناتی اماں کو جانے کیا ہوا کہ یک ٹک سفید قمیض شلوار پر پھیلے نیلے دوپٹے کو تکے چلی گئیں۔ سفید، سفید ملائی جیسی پشت پر یہ بڑا پوری پیٹھ پر پھیلا نیلا لیھا۔

ہیچوں، ہیچوں کی آواز پر پایو گھبرا کے پلٹی تو اماں پوری جان سے غافل ہو چکی تھیں، اُن کی دونوں باچھوں سے پھین نکل رہا تھا اور کٹی ہوئی سبزی آدھی سینی میں تو آدھی اُن کے اُوپر تھی۔

"ارے منحوس کھڑا تماشہ کیا دیکھ رہا ہے بھاگ کے ٹھنڈے پانی کا گلاس لا۔" بھابی جان نے اس کی خبطی صورت کو قہر کی نگاہ سے گھورتے ہوئے حکم چلایا اور ایک منٹ انتظار کیے بغیر وہ دیور کی طرف پلٹیں۔

"اے بھیا دیکھنا تو کہاں غارت ہو گیا یہ ڈوبا۔"

اُسی روز زمان میاں فریدہ سمیت اپنے چک سے واپس آئے تو سوغات نے ڈرڈر کے انہیں اماں کی حالت بتائی۔

"میاں جی! نمبر پانچ کو بھی ایک مرتبہ کیمپ میں اس طرح خبر نہیں کیا ہوا تھا، موٹے سردار نے پہلے اپنے چابک سے اُسے خبردار کرنا چاہا پھر جی پتہ نہیں کیا ہوا تھا اس روز نمبر پانچ کو کہ سردار کے چابکوں پہ بھی اُچھل اُچھل کر، ہیچوں، ہیچوں کرتا رہا تو سردار نے اس کی گردن مروڑ دی تب وہ ٹھیک ہو گیا۔"

"کیا؟" زمان میاں ہونق رہ گئے۔

"ہاں جی پھر وہ ٹھیک ہو گیا' اس کی ہیچوں ہیچوں بند ہو گئی اور سردارے نے ہم سب سے کہا'
" اوے اُلو دے پٹھیو چل کے اپنے پیو کی قبر بناؤ" اور ہم سب نے مل کر اُسے دبا دیا جی' میری
اُس سے بڑی یاری تھی اُس کے بغیر میرا جی نہیں لگتا تھا اس لیے میں بھاگ نکلا وہاں سے" زمان میاں نے منہ پھیر
کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو ان کا لاغر سا بھاری ہاتھ کانپ رہا تھا۔

"لے چل میاں ذرا لگا تو جوتوں پہ رگڑ کے گھسا۔ ایک دم فرسٹ کلاس پالش ہو" صمد نے جوتوں
کی جوڑی اس کے آگے ڈالی تو زمان میاں ملامتی نظروں سے اُن کے مضبوط ہاتھوں کو دیکھ کے رہ گئے۔

" فریدہ کیا ہم اس بچے کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے؟" انہوں نے جیسے خود سے الجھ کر گوشتی کی
"ارے کیا دماغ پھرا ہے وہاں پہ کوئی نہیں ملتا تو یہاں سے بٹور کے لے جاؤ گے یتیموں غریبوں
کی کھیپ؟ ارے اتنے جوتے لگائے گی وہاں کی حکومت کہ ایک بال سر پر نہ رہے گا" زمان میاں ان کے
جواب پر چپ چاپ اُٹھ کے کمرے میں چلے گئے۔ آنکھیں بند کر لیں

یونہی ذرا سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹے تھے کہ کب نیند سو گئے۔ گھنٹوں بعد آنکھ کھلی تو شام جھک
چکی تھی ہر طرف دھندلے مٹیالے اندھیرے اُتر رہے تھے۔ ایک دم وہ ڈر سے گئے نیم اندھیرے کمرے
میں سوغات ان کے قریب بیٹھا گتے کے ٹکڑے سے آہستہ آہستہ پنکھا کرتے انہیں ایسی نظروں سے دیکھ
رہا تھا جیسے وہ چک نمبر ۱۵۲ کے چودھری محمد زمان نہیں آثار شریف ہوں' مقدس' متبرک' ہیں جی
میاں جی! ایک بات دسوں آپ کو وہ جو موٹا مسٹنڈا تھا نا جو تیجے دن پہ کسی ایک نمبر ۱۰ کا بند
کر دیتا' کہتا تھا کہ تم سارے کے سارے کھا کھا کے مسٹنڈے ہو رہے ہو' جب بھی میرا کھانا بند ہونے کی
باری آتی' نمبر پانچ اپنے حصے کی آدھی روٹی میرے لئے چھپا کے رکھ لیتا۔ زمان میاں نے دوبارہ آنکھیں بند
کر لیں' بھوک سے ہلکی نحیف اور بے بس آوازیں ان کے اندر باہر اُدھم مچانے لگیں۔

پہلے تو کبھی دھیان نہیں آیا مگر اب خبر نہیں کیا کیا ہے' جب روٹی کھانے بیٹھتا ہوں تو سوچ سی آجاتی
ہے۔ نمبر پانچ میرے لیے اپنے حصے کی آدھی روٹی بچا کے لاتا تھا مگر میں نے کبھی ایک بُرکی بھی اس کے لیے
نہیں رکھی۔ کیا میرا پیٹ دنیا میں سب سے بڑا ہے؟ مجھے سب سے زیادہ بھوک کیوں لگتی ہے۔

بھوکے پیٹ کی اینٹھن نہ کسی کو فلسفی بننے دیتی ہے نہ مفکر' تیری سمجھ میں نہیں آئے گی یہ بات
کہ کیوں اب تیری سوچوں میں زندگی تھرتھرانے لگی ہے۔ اُسے جواب دینے کے بجائے زمان میاں صرف
سوچ کے رہ گئے۔

بھابی جان فرج سے نکالی ٹھنڈی ٹھنڈی سردے کی قاشیں کاٹ کے پپو کو لاڈ سے کھلا رہی تھیں زبردستی

بہلا بہلا کے پھلا رہی تھیں کہ اچانک اُسے کونے میں کھڑا للچّے کوّے کی طرح سردے کی قاشوں پہ نگاہ جمائے دیکھ کے اُن کے پتنگے لگ گئے۔

" ارے موت آئے تجھے جنم پیٹے! کیسی ہونسائی نظروں سے گھور رہا ہے۔" انہوں نے بیٹھے بیٹھے ہی گھما کے چپل پھینکی جو سیدھی سڑاک سے اس کی ناک پہ جا کے پڑی۔

"ائے ہے دے دیتیں دو قتلے اسے بھی بچہ ہی تو ہے" پتلی سی سُرخ دھار اس کی ناک سے بہتے دیکھ کر اماں کو ترس آ گیا۔

" قسم ہے آپ کو۔ بیّو کی اماں جان جو دیا ہوگا اسے ذرا سا بھی چکھنے کو! ارے ایسے گھور گھور کے دیکھ رہا تھا حرامزدہ اب خبر نہیں میرے بچّے کو ہضم بھی ہوتا ہے یا نہیں۔" بھابی جان طنطنا کے چلائیں۔

" لے اللہ مارے گنڈیریاں چوس لیجیو اس کی۔" بہو کی چیخ پکار پہ اماں نے چپکے سے چونی اس کی ہتھیلی پہ رکھ دی کہ کہیں پٹ پٹا کے بھاگ ہی نہ جائے۔ مگر وہ بھی پرکھ پورا اللہ مارا ہی تھا چار آنے کی گنڈیریاں چوس ڈالنے پر بھی نیت فرج میں رکھی سردے کی قاشوں ہی میں لگی رہی۔ موقع پاتے ہی اس نے ادھر اُدھر دیکھ کے چپکے سے فرج کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ پایٔو نے عین وقت پہ چوکس سپاہی کی طرح چھاپہ مارا۔۔۔

" کمینے، چوٹٹے۔" اس نے ایسے جھٹکے سے سوغات کو پلٹایا کہ اس کی مسکی مسکائی پرانی قمیض چر چرا کے پھٹ گئی۔ پوری کی پوری دامن تک، تب خدا جانے کیا ہوا پایٔو کی آنکھیں غبارے کی طرح پھیل گئیں اور اس پر وہ دورہ پڑ گیا جس پہ گھر میں صرف اماں کی اجارہ داری تھی، سفید سفید جھاگ اڑاتی وہ باؤلوں کی طرح چیخنے لگی،

" اماں، اماں۔ لمبا نیلا لمبا پوری پیٹھ پہ لمبا۔"

" کہاں، کدھر، کس کے؟"

سارے کے سارے اپنی جگہ سے ہل گئے اور وہ بوکھلا کر سراسیمگی حالات میں بھاگ کھڑا ہوا۔ اندھوں کی طرح، پاگلوں کی طرح اُنہی ریت کے صحراؤں کی طرف، اُنہی سوکھی سڑی جھاڑیوں میں سرسراتے سانپوں کی طرف جن سے بچ کے ایک روز وہ انسانوں کی بستی کی طرف بھاگا تھا۔ بڑے بڑے سانپوں نے اس کے چھوٹے سے وجود کو دوبارہ تاک لیا اور سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ زبان کی نوک کاٹ کے اُس کے جسم پر زخموں کی پھلواری کاڑھتے وہ اُسے وہیں گھسیٹ لے گئے جہاں سے وہ نصیب کا ایک لمحہ چُرا کے بھاگا تھا۔

امّاں کے دورے خطرناک حد تک بڑھ گئے سارا وقت ہچکوں ہچکوں کرکے ہچکتی رہتیں۔
زمان میاں کے پاؤں چھو چھو کے منتیں کرتیں۔ تجھے پنجتن پاک کا واسطہ بتادے کون تھا وہ شہزادہ۔
کہاں سے تو تو پیچی میں سوغات لایا تھا، میرے لیے خبر نہیں کتنی مسافتیں طے کرکے پہنچا ہوگا وہ دوبارہ اِس
گھر تک، ارے کھالینے دیا ہوتا اُسے ذرا سی سردے کی قاشیں ہی تو تھیں، تم سب کے کلیجے تو نہیں
تھے۔ مرجائے تو کلموہی۔ منحوس۔ وہ بلک بلک کے پائیو کو کوسنے لگتیں۔
دھڑا دھڑ اس کے لیے اخباروں میں لکیریں کھنچ گئیں، زمان میاں کے ساتھ ہاشمی صاحب
کے یہاں آنے والے بچے گھر واپس پلٹ آؤ۔ یہاں تمہارے گھر والے تمہاری راہ تک رہے ہیں۔
یہ اُس بچّے کے لیے چھپا جو ایک لفظ نہ پڑھ سکتا تھا اور جانے اُن کا تھا بھی یا نہیں۔

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے، تبصرہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں)

نام کتاب: اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم مقالہ نگار: ڈاکٹر حنیف کیفی

قیمت: ساٹھ روپے ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر حنیف کیفی نے گذشتہ چند برسوں میں اپنی تصانیف اور مضامین کے ذریعے اردو دنیا میں ایک معتبر محقق اور سلجھے ہوئے نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کرلی ہے۔ زیر نظر کتاب ڈاکٹر حنیف کیفی کا مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔

ایک اچھا محقق اور نقاد بننے کے لیے صاحبِ ذوق ہونا اولین شرط ہے۔ جو شخص شعر و ادب کا مذاقِ صحیح نہ رکھتا ہو وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں کوئی قابلِ قدر کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ حنیف کیفی اس شرط کو بدرجۂ احسن پورا کرتے ہیں، انھوں نے اردو شعر و ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ مغربی ادب سے بھی کما حقہ، واقفیت رکھتے ہیں۔ عروض و بلاغت اور بدیع پر انھیں مکمل دسترس حاصل ہے جس کے بغیر اس مقالے کے موضوع سے انصاف کرنا ممکن نہ تھا۔

اردو میں معرّا اور آزاد نظم نگاری پر بہت سے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ کنول کرشن بالی نے آزاد نظم پر ایک مختصر کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کے باوجود معرّا نظم اور آزاد نظم کے سانچوں اور فن کے تعلق سے بہت سے مسائل مزید تفتیش و تحقیق کے محتاج رہے۔ اردو میں ان سانچوں کے اختراع اور ارتقاء کے بارے میں بھی کافی اختلافِ رائے رہا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے نہایت تحقیق اور غور و فکر کے ساتھ ان مسائل کا جائزہ لیا ہے اور بہت سے امور کی یکسوئی کر دی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بعض نئے مباحث اٹھائے ہیں جن سے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔

کتاب کے پہلے باب میں اردو شاعری پر انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے جس کی وجہ سے اردو میں جدید نظم نگاری کی تحریک شروع ہوئی اور نئی اصنافِ شاعری کا رواج

ہوا۔ ان کے علاوہ ہندی اور سنسکرت کے اثرات   ۔ اس سلسلے میں انہوں نے اسٹانزا فارم' ترائیلوں' سانیٹ' اردو گیت اور گیت نما نظموں اور ادبِ لطیف کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ یہ باب نہایت معلومات آفریں ہے۔

بعد کے ابواب میں انھوں نے نظم معرّا اور نظمِ آزاد کی ساخت اور تکنیک سے بحث کی ہے اور ان کے اصول و لوازم کا تعین کیا ہے۔ ایک مستقل باب انگریزی بلینک ورس کے بارے میں ہے۔ اردو میں نظم معرّا اور نظمِ آزاد کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ الگ الگ ابواب میں تفصیل کے ساتھ لیا گیا ہے اور مصنف نے تمام ضروری مواد نہ صرف سلیقے کے ساتھ یک جا کر دیا ہے بلکہ اس کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے آزاد نظم میں داخلی آہنگ اور خارجی آہنگ کے توافق پر بجا طور پر زور دیا ہے لیکن ڈاکٹر منیب الرحمٰن کے وضع کردہ قانون کی تائید کرتے ہوئے انھوں نے ایک ہی بحر کے ارکان کی کمی بیشی پر اصرار کیا ہے جو نامناسب ہے۔ آزاد نظم کے تجربے کی ضرورت اس لیے تھی کہ ارکانِ بحر کی تکرار سے پیدا ہونے والے روایتی' غنائی آہنگ کی یکسانیت پیچیدہ تجربوں کے صوتی اظہار میں رکاوٹ حائل کرتی ہے۔ اصل مقصد اس روایتی آہنگ کی گرفت سے رہائی حاصل کرنا تھا تاکہ داخلی واردات اور تجربوں اور ان کے صوتی ابلاغ میں دوئی نہ رہے۔ نام نہاد آزاد نظم نگاروں نے ارکانِ بحر کی پابندی اور بحروں کے محدود انتخاب کے ذریعہ اس مقصد کو کھو دیا۔ بحروں سے منسلک رہتے ہوئے بھی آہنگ کے بے شمار تجربوں کی گنجائش تھی جس کا کم ہی استعمال کیا گیا۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے شمس الرحمٰن فاروقی کی اس تجویز سے اختلاف کیا ہے کہ ایک دو افاعیل کی باقاعدہ تکرار ہی سے نظموں کا ڈھانچا تیار کرنے کے بجائے اس بحر کے زحافات کو بھی کام میں لانا چاہیے۔ علاوہ ازیں ایک ہی نظم میں مختلف بحریں استعمال کرنے کی بھی انھوں نے رائے دی ہے جس سے حنیف کیفی متفق نہیں ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اس کی وجہ سے آہنگ بگڑ جائے گا اور نظم ایک میکانکی عمل ہو کر رہ جائے گی۔ یہ اندیشہ درست نہیں ہے۔ شاعر اگر اچھا اور صناع ہو تو وہ زحافات کا استعمال اس انداز سے کرے گا کہ آہنگ بگڑے گا نہیں بلکہ ایک خوشگوار تنوع پیدا ہو جائے گا۔ ایک سے زیادہ بحروں کے استعمال کی گنجائش خود ہمارے عروضی نظام ہی سے نکل آتی ہے۔ ایک دائرے سے تعلق رکھنے والی بحریں چھوٹے اور طویل مصوتوں کی مخصوص ترتیب سے بننے والی زنجیر کا حصہ ہوتی ہیں۔ ان بحروں کی باہم تبدیلی اور امتزاج سے آہنگ کے نئے اور خوشگوار تجربے کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہزج اور رمل کو بہ آسانی ایک دوسرے میں مدغم کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر حنیف کیفی نے اس تنازعے کو حل کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ نظم آزاد کا موجد کون ہے۔

شررؔ نے بحر کی پابندی کے ساتھ جو منظوم ڈراما "فتح اندلس" لکھا تھا ڈاکٹر گیان چند جین نے اسے "آزاد نظم" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ اسے نظم معریٰ کہتے ہیں کیوں کہ مختلف مکالموں کو ملا کر پڑھیں تو مصرعے مکمل ہو جاتے ہیں لیکن مختلف کرداروں کے مکالموں کو ملا کر پڑھا جائے تو ڈرامائیت باقی نہیں رہے گی اور جب ہر مکالمہ جداگانہ لہجے میں ادا کیا جائے گا تو نظم کی بحر کا روایتی آہنگ برقرار نہیں رہے گا۔ اس اعتبار سے "فتح اندلس" کے سانچے کو آزاد نظم ہی کہنا مناسب ہوگا۔ اس بنا پر نظم آزاد کی ایجاد کا سہرا شررؔ ہی کے سر جاتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس تجربے کو مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تا آں کہ تصدق حسین خالد، ن م۔ راشد اور میراجی نے اس صنف کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اب رہا یہ سوال کہ نظم آزاد کے تجربے کی تجدید اور احیا میں کس نے پہل کی۔ ڈاکٹر حنیف کیفی نے یہ شہادت فراہم کی ہے کہ تصدق حسین خالد نے ۱۹۲۵ء میں آزاد نظمیں کہی تھیں جب کہ ن م راشد کی پہلی آزاد نظم ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس لیے ان کے خیال میں اولیت خالد کو حاصل ہے۔ خالد کی نظموں کا مجموعہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ پتہ نہیں چلتا خالد نے ۱۹۲۵ء میں سب سے پہلی آزاد نظم کون سی کہی تھی اور آیا وہ اس مجموعے میں شامل بھی ہے۔ جب تک اس نظم کی نشان دہی نہیں ہو جاتی ساغر نظامی، ڈاکٹر عبداللہ اور خود ن۔ م۔ راشد کے بیانات کے باوجود تصدق حسین خالد کی اولیت غیر مسلّمہ رہے گی۔

ان چند اختلافی مباحث سے قطع نظر زیر تبصرہ کتاب ایک جامع اور مکمل تصنیف ہے۔ جیسا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے اس موضوع پر اب تک سب سے اچھا کام ہے۔ کتاب کے مطالعے کے بعد قارئین پروفیسر مسعود حسین کی اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ "اس تصنیف سے حنیف کیفی صاحب کے وسیع مطالعے اور علمی گرفت دونوں کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ نہ صرف اس موضوع پر ایک اہم اضافے کا حکم رکھتی ہے بلکہ عرصے تک، اس موضوع پر علمی کام کرنے والے کے لیے یہ ایک اہم حوالے کی کتاب کی حیثیت رکھے گی۔

—— پروفیسر مغنی تبسم

نام کتاب: **موتی، پھول، ستارے**　شاعر: **بدیع الزماں خاور**　صفحات: ۸۸

قیمت: ۱۰ روپیے　ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲-۱۱۰۰۰

"موتی، پھول، ستارے" بدیع الزماں خاورؔ کے طبع زاد کلام کا مختصر انتخاب ہے۔ انتخاب اور ترتیب کلام ان کے شاگرد پرویز باغی نے کیا ہے جو جدید تر نسل کے ذہین شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

یہ مجموعہ مئی ۱۹۸۴ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔ بدیع الزماں خاور ایک قادر الکلام اور پُرگو شاعر ہیں

اب تک ان کی غزلوں، قومی وطنی نظموں، گیتوں، رباعیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
اُن کے کلام کے چھ مجموعے ۱۔ حروف ۲۔ میرا وطن ہندوستان ۳۔ بیاض ۴۔ امرائی ۵۔ لفظوں کا پیرہن ۶۔ سات سمندر، شائع ہوئے ہیں۔ حروف میں نظمیں اور غزلیں ہیں۔ 'میرا وطن ہندوستان' میں قومی اور وطنی نظمیں ہیں۔ 'بیاض' ان کی منتخب غزلوں پر مشتمل ہے۔ 'امرائی' میں نظمیں اور گیت ہیں۔ 'لفظوں کا پیرہن' نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ سات سمندر میں صرف غزلیں ہیں۔ 'ننھی کتاب' کے عنوان سے جنوری ۱۹۸۳ء میں خاور نے بچوں کے لئے لکھی ہوئی اپنی نظمیں شائع کی ہیں۔ انہوں نے مراٹھی نظموں کے ترجمے بھی کئے جنھیں 'خوشبو' کے زیر عنوان شائع کئے ہیں۔ مراٹھی نظموں اور ابھنگوں کے ترجموں پر مشتمل ان کا ایک اور مجموعہ 'سبیل' بھی منظر عام پر آ چکا ہے۔ 'مہاراشٹر کی تہذیبی اور ادبی قدریں' کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

اس خوبصورت مجموعہ میں بدیع الزماں خاور کی منتخب نظمیں، غزلیں، تین رباعیاں اور 'اشعار' کے زیر عنوان (۵۱) منتخب اشعار ہیں جو حروف، بیاض، "لفظوں کا پیرہن" اور 'سات سمندر' سے منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ مجلد اور اس کا ٹائیٹل دیدہ زیب ہے۔ کتابت اچھی، کاغذ عمدہ ہے۔ نظموں، غزلوں اور رباعیات کے انتخاب اور ترتیب سے مرتب کے پاکیزہ اور اعلیٰ شعری ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔

نظموں کی حصے میں 'حروف' سے سات نظمیں، 'میرا وطن ہندوستان' سے پانچ 'امرائی اور لفظوں کا پیرہن' سے چھ چھ نظمیں شامل کی گئی ہیں۔ امرائی سے 'آج رات کو' کے زیر عنوان ایک گیت بھی اس مجموعہ یعنی مرتی، پھولوں اور ستاروں کی زینت ہے۔ اس انتخاب میں حروف سے پانچ، بیاض سے چھ، اور لفظوں کا پیرہن سے دس اور سات سمندر سے تیرا غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ سات سمندر سے ایک آزاد غزل بھی شریک اشاعت ہے۔ لفظوں کا پیرہن سے تین رباعیاں منتخب کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک رباعی پیش کرتا ہوں۔

پوچھا ہے تو پوچھا ہے اُسی کو میں نے
ڈھونڈا ہے تو ڈھونڈا ہے اُسی کو میں نے
وہ بندۂ عاشق ہوں کہ جب بھی اس سے
مانگا ہے تو مانگا ہے اُسی کو میں نے

اس رباعی کے پڑھنے کے بعد کسی مشہور شاعر کا یہ شعر بے ساختہ یاد آتا ہے:

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

پرویز یدالہی نے مارچ ۱۹۸۹ء میں "گوکن کا منتی" کے عنوان سے بدیع الزماں خاور کے فن اور ان کی شخصیت پر اردو کے ممتاز ادیبوں، نقادوں اور شاعروں کے گراں قدر مضامین شائع کئے تھے۔ یہ کتاب پریم گوپال متل کے زیر اہتمام موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی نے شائع کی تھی۔ اس کتاب میں شامل مضامین میں خاور کو ایک ممتاز شاعر، کامیاب مترجم اور ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے خراجِ تحسین ادا کیا گیا ہے۔ خاور نے اپنے ادبی اور تخلیقی سفر کے پچیس سال پورے کرلئے ہیں، لیکن ان کا یہ ادبی سفر ہنوز جاری ہے۔ ان کی تخلیقات کے مطالعہ سے ان کے ہنوز تازہ دم ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

موجودہ زمانے میں اردو ادب ایسے جیالے قلمکاروں کی شدید ضرورت ہے، جو اپنی اعلیٰ معیاری تخلیقات سے ادب کے ذخیرہ میں قابلِ قدر اضافہ کریں، جس سے ہمارے ادب کے مقام، مرتبہ اور مقبولیت میں اضافہ ہو۔ اعجاز صدیقی، مالک رام، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، گوپال متل وغیرہ جیسے اردو زبان وادب کے ممتاز خدمتگاروں نے بدیع الزماں خاور کی مسلسل اور ان تھک علمی، ادبی اور شعری خدمات کو پُرزور الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

بدیع الزماں خاور نے انگریزی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ نے ان کے خیالات میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی ہے وہ جب اپنے فکر وخیال کی شمعیں روشن کرتے ہیں تو ان کی تخلیقات کے مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ اُن کے جذبہ، احساس، مشاہدہ، تجربہ کی صداقت ان کے کلام کو تابندہ وپائندہ رکھے گی۔ ہماری زبان وادب سے ان کی پُرخلوص اور والہانہ وابستگی، عشق کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اُن کی غزلیں آپ بیتی بھی ہیں اور جگ بیتی بھی۔

"موتی۔ پھول۔ ستارے" میں ایسی نظمیں ہیں جن کا تاثر گہرا اور دیرپا ہے اور دل کے سوئے جذبات کو جھنجھوڑتا اور بیدار کرتا ہے۔ نظموں کے عنوانات میں تنوع سے اُن کے ذہن کی کشادگی کا ثبوت ملتا ہے۔

وہ ایک کامیاب اور کامران شاعر ہیں جنھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرکے زندہ اور باقی رہنے والی تخلیقات پیش کی ہیں۔

اُن کی غزلوں سے بطور مشتے نمونہ از خروارے چند اشعار پیش ہیں:

دیارِ درد سے بچ کر کوئی کہاں جائے
کہ راستہ ہے یہی ایک زندگی کے لیے

مرے بزرگو! مرا کرب تم نہ سمجھو گے
تمہارا دَور کہاں تھا مری صدی جیسا

درد نے جوڑے ہیں رشتے ورنہ
کون دنیا میں کسی کا ہوتا!

جسے بھی دیکھیے پیاسا دکھائی دیتا ہے
کوئی مقام ہو صحرا دکھائی دیتا ہے

تبصرہ کچھ یوں کیا کرتی ہے میرے حال پر
مجھ سے بہتر جانتی ہے جیسے یہ دنیا مجھے

ان ہواؤں میں اگر زہر نہیں ہے کوئی
آدمی سانس بھی لیتے ہوئے ڈرتا کیوں ہے؟

دیکھ سکتے ہو تو مُرجھائے ہوئے پھولوں میں
کوئی بیتے ہوئے موسم کی نشانی دیکھو

بدیع الزّماں خاؔور کی نظموں میں "امرائیوں کی شہزادی"، "لفظ اور ہم"، "والد کی یاد میں" ایسی بھرپور تاثراتی نظمیں ہیں جن سے دل پر دیر تک اثر انگیز کیفیت طاری رہتی ہے۔ "امرائیوں کی شہزادی" "امرائی" سے "لفظ اور ہم" اور والد کی یاد میں لفظوں کا پیرہن سے منتخب کی گئی ہیں۔ "امرائی" سے ایک خوبصورت گیت "آج رات کو" بھی شاملِ اشاعت ہے۔ جس کا یہ شعر ذہن میں گونجتا ہی رہتا ہے:

آج رات کو البیلا شہزادہ میرے خواب میں آئیگا
آج رات کو میرا دامن ستاروں سے بھر جائے گا

غرض "موتی، پھول، ستارے" بدیع الزماں خاؔور کے شعری سفر کی روشن منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

محمد منظور احمد



وقار خلیل

اُردو نامہ

اردو کی علمی ادبی اور تہذیبی خبریں

یکم ستمبر: ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی مجلسِ انتظامی کا اجلاس صدر ادارہ جناب حامد علی عباسی کی صدارت میں بمقام "ایوانِ اُردو" منعقد ہوا۔ مالیاتی اور دفتری اُمور کے علاوہ سب رس اور شعبہ امتحانات کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا اور ادارہ کی اشاعتی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بعض اہم مطبوعات کے سیکنڈ ایڈیشن شائع کیے جانے پر غور کیا گیا۔ مجلسِ تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر جناب حامد علی عباسی، جناب محمد منظور احمد معتمد اور اراکین میں پروفیسر سراج الدین پروفیسر سیّدہ جعفر، صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی، پروفیسر مغنی تبسم ڈاکٹر انور معظم اور مولوی محمد مرتضیٰ قادری کے نام شامل ہیں۔

۴ ستمبر: کراچی (پاکستان) سے موصولہ اطلاع کے مطابق ممتاز عثمانین اور فیض شناس ادیب مرزا ظفر الحسن کا انتقال ہو گیا۔ مرزا صاحب کی پہلی کتاب "دھوپ چھاؤں" (کہانیاں) ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے چھپ چکی ہے۔ مرزا ظفر الحسن "ادارۂ غالب" کے بانی اور ایک اچھے کتب خانہ کے ناظم نیز فیض احمد فیض پر اپنی تحریروں اور تالیفات کے علاوہ حیدرآباد دکن اور جامعہ عثمانیہ کی یادوں پر مشتمل اپنی مطبوعات کے باعث برصغیر ہند و پاک کے ادبی اور علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کی وفات ادبی سانحہ قرار پاتی ہے خدا مغفرت فرمائے۔

۶ ستمبر: مرزا ظفر الحسن صاحب مصنف ذکرِ یار چلے اور دکن اُداس ہے کی وفات حسرت آیات پر ریاستی انجمن ترقی اُردو کے صدر ڈاکٹر سیّد عبدالمنان نے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات سے مخدوم اور میر حسن کے گروپ کا ایک اہم فرد جاتا رہا۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول اور یہاں کی نصف صدی اُدھر کی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر دُنیائے ادب سے اپنی کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ مرزا صاحب نے جو کردار ادا کیا ہے اسے ناقابلِ فراموش کارنامہ سمجھا جائے گا۔

۱۲ ستمبر: فرقہ وارانہ فسادات میں مشہور کتب خانہ سعیدیہ لائبریری کی ۲۰۰ مخطوطات اشرار کے ہاتھوں تباہ ہوئیں۔ ایک اور لائبریری حیدری گشتی کتب خانہ کو بھی نشانہ بنایا گیا۔

۲۳ ستمبر: جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست نے ایک شعری محفل میں ضیاء موسوی کی کتاب "اسرارِ حق" کی رسم اجرا انجام دی۔ خیرات ندیم، دلاور حزیں، ساجد رضوی، زاہد رضوی باقر رضوی اور ستار چشتی نے کلام سنایا۔

OCTOBER 1984

R. N. 10922/57.
Regd. H/HD. 134.

The "SABRAS" Urdu Monthly

Organ of "Idara-e-Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-500 482. (A. P.)

اسلوب اور انتقاد





بالِ جبریل

ضربِ کلیم

مکاتیبِ راشد

National Fine Printing Press, Charkaman, Hyd.